اسلامی نظام تعلیم

سید ریاست علی ندوی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ (یو-پی)

اسلامی نظام تعلیم

مسلمان علما نے فنِ تعلیم پر جو کتابیں لکھی ہیں یا تعلیم سے پہلے جو نظریے پیش کیے ہیں یا جو متفرق خیالات ظاہر کیے ہیں، ان کو اس رسالہ میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

از

مولانا سید ریاست علی ندویؒ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ یوپی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

سلسلۂ دارالمصنّفین نمبر: ۵۶

نام کتاب	:	اسلامی نظام تعلیم
نام مصنف	:	مولانا سید ریاست علی ندوی
صفحات	:	۱۷۶
ایڈیشن	:	(جدید معیاری ایڈیشن ۲۰۱۱ء)
مطبع	:	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
ناشر	:	دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
قیمت	:	۹۰/روپے
باہتمام	:	عبدالمنان ہلالی

ISBN:978-93-80104-83-6

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.BOX NO:19

SHIBLI ROAD,AZAMGARH 276001(U.P.)

E-Mail: shibli- academy@rediff mail.com

Website:www.shibli academy.org

فہرست مضامین

اسلامی نظام تعلیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حَامِدًا وَمُصَلِّیًا

آج کل فن تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے، ہر طرف ٹریننگ اسکول اور کالج کھلے ہیں، مدرس تیار کیے جاتے ہیں، فن تعلیم پر نئی نئی کتابیں لکھیں جاتی ہیں اور نئے نئے نظریے آزمائے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کبھی روئے زمین پر مسلمانوں کی قوم بھی آباد تھی اس کی ترقی وعروج کے عہد میں بھی اس فن پر کتابیں لکھی گئی تھیں اور علمائے اہل تدریس نے اپنے خیالات کتابوں اور رسالوں میں تحریر کیے تھے اور کتاب وسنت، بزرگوں کے واقعات اور تجربوں سے تعلیم کے کچھ گر انہوں نے سمجھے تھے اور ان کو اصول وقواعد کی حیثیت میں ترتیب دیا تھا۔

ضرورت تھی کہ اس فن پر مسلمان علما نے جو کتابیں لکھی ہیں یا اپنی تصنیفات میں تعلیم سے متعلق جو نظریے بتائے ہیں یا متفرق خیالات ظاہر کیے ہیں یا بزرگوں کے تعلیمی

واقعات و معاملات سے جو اصول آج سمجھے جا سکتے ہیں ان کو ترتیب سے یکجا کر دیا جائے۔

دارالمصنفین کی طرف سے اس کام کا ارادہ اکثر ہوتا رہا، خوش قسمتی سے دو سال ہوئے کہ مسلم تعلیمی کانفرنس علی گڑھ نے اپنے پچاس سال کی عمر کی جوبلی منائی، اس تقریب سے ''اسلامی نظام تعلیم'' کی ترتیب کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا چنانچہ دارالمصنفین کے لائق رفیق مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی نے اس کام کے لیے آمادگی ظاہر کی اور ڈیڑھ دو مہینے کی محنت میں یہ مقالہ بلکہ رسالہ لکھا، میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ کانفرنس کے لیے اس کا خلاصہ کر لیں، باقی پورا رسالہ معارف میں چھپے، پھر الگ رسالہ بنے چنانچہ اسی مشورہ پر عمل ہوا۔

مصنف نے کتابوں کی ورق گردانی، واقعات کی تلاش، اصولوں کے استنباط اور مسائل کی چھان بین میں جو زحمت اٹھائی ہے وہ کتاب کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے، یہ اسلامی نظامِ تعلیم کا آئینہ ہے جس میں اس بحث کا ہر پہلو پوری طرح نمایاں ہے، امید ہے کہ اہل علم اس کی پوری قدر کریں گے اور اہل تعلیم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

سید سلیمان ندوی

۱۵/ جمادی الثانیہ ۱۳۵۷ھ

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی نظام تعلیم

اسلامی نظام تعلیم کی سرگذشت پر ابھی تک مشرق و مغرب کے اہل علم کو بہت کم توجہ کرنے کا موقع مل سکا ہے اور جن لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا ہے وہ معلومات کی کمی بنا پر عجز کے اقرار کے بغیر آگے نہ بڑھ سکے اور اس سلسلہ میں اب تک برہان الدین زرنوجی کے ایک رسالہ تعلیم المتعلم کے سوا کوئی دوسرا قیمتی ماخذ یورپ کے اہل علم کے سامنے موجود نہیں رہا۔

چنانچہ اس موضوع پر سب سے پہلے ۱۷۰۹ء میں موسیو ریلنڈس (Ralandus) نے زرنوجی کے اس رسالہ کو جرمنی سے شائع کیا اور غالباً جرمن مستشرق ڈاکٹر فریڈریچ وسٹیفیلڈ (Frieduich Wustefeld) نے اسی رسالہ کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا، پھر ۱۸۳۸ء میں موسیو کاسپاری نے اسے لائبزک سے لاطینی زبان کے ترجمہ اور موسیو فلیشر

کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا(۱)اس کے بعد ایک دوسرے فاضل مستشرق ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک(Daniel Haneberg)نے ۱۸۵۰ء میں میونخ یونیورسٹی میں ایک مختصر اور سرسری معلومات کا حامل مقالہ اس موضوع پر پڑھا جسے ایک مسلمان فاضل نے ''اسلامی نظام تعلیم'' کے نام سے ہندوستانی زبان میں بھی منتقل کردیا ہے، اس میں ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

''تاریخ تمدن کا یہ پہلو نہایت اہم ہے اور حیرت ہے کہ باوجود اس قدر اہم ہونے کے اب تک بہت کم علمانے اسے اپنی توجہ کا مستحق سمجھا ہے بلاشبہ اس موضوع کے بعض حصوں پر کافی محنت صرف کی گئی ہے لیکن جزئیات کے متعلق کئی ایک سوال ہیں جن کی تحقیق ابھی باقی ہے، جہاں تک اس موضوع کی مجموعی حیثیت کا تعلق ہے، خود سلین(Slane)جس نے اسلامی مدارس کا مختصر خاکہ ابن خلکان کا ترجمہ کی دوسری جلد میں کھینچا ہے)نے بھی اس سے زیادہ جرأت نہیں کی کہ محض ایک مختصر خاکہ کھینچ دے۔(۲)

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے ''تاریخ التعلیم'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں یونان اور روما پر تو صفحوں کے صفحے لکھے گئے ہیں مگر جب عربوں کے دور حکومت کی باری آئی تو انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ:

''اس امر کے متعلق معلوم کرنے کے لیے کہ مسئلہ تعلیم کی نسبت اہل عرب کے کیا خیالات تھے بہت کم مواد موجود ہے، تعلیم کی تاریخ پر اہل یورپ میں جن لوگوں نے تصانیف کی ہیں اگر چہ وہ اپنی تصانیف میں اوائل زمانہ کے حالات درج کرتے ہیں لیکن اہل عرب کے زمانہ کو قطعاً چھوڑ جاتے ہیں''(۳)

---

(۱)معجم المطبوعات العربیہ جلد اص ۹۶۹ و اکتفاء القنوع بماھو المطبوع، ص ۱۹۰۔

(۲)اسلامی نظام تعلیم ص ۱۰۔(۳)تاریخ التعلیم ص ۴۶۔

درحقیقت اس وقت تک اسلامی نظام تعلیم پر جو کچھ مواد فراہم ہوا ہے وہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے چند مضامین کے مجموعہ کے باہر نہیں ہے لیکن علامہ موصوف نے ان میں زیادہ تر اسلامی مدارس پر توجہ رکھی ہے اگرچہ اسلامی نظام تعلیم پر بھی انہوں نے مضامین لکھے ہیں لیکن ان میں ندوۃ العلماء کے تعلق سے زیادہ تر ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں کے نصاب پر نظر ڈالی گئی ہے، نفس اصول وطریق تعلیم، اسلامی نظام تعلیم کے رو سے اساتذہ وطلبہ کے فرائض اور مدارس اور دار الاقامہ کے نظم ونسق وطرز بودوماند وغیرہ پر انہیں بھی توجہ فرمانے کا موقع نہیں ملا، مولانا عبدالسلام ندوی نے التربیۃ الاستقلالیہ کے مقدمہ میں جسے ایجوکیشنل کانفرنس نے شائع کیا ہے، اسلام تعلیم پر نظر ڈالی ہے لیکن ان کی توجہ بھی زیادہ تر مسئلہ نصاب اور اس کی اصلاح پر مبذول رہی ہے اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے ''علمائے سلف'' کے سوانح میں جستہ جستہ ان کی طالب علمی کے حالات بھی لکھے ہیں۔

قدیم ماخذ میں فن تعلیم پر مباحث: قدیم عربی ماخذوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو علمائے اسلام میں سے جن لوگوں نے اسلامی اصول وطریق تعلیم پر توجہ کی، ان میں امام اعظم ابوحنیفہ، امام بخاری، حافظ ابن عبدالبر، امام غزالی، برہان الدین زرنوجی، قاضی ابن الجماعہ، محمد بن ابوزید اور علامہ ابن خلدون کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

امام اعظم علیہ الرحمۃ کا ایک رسالہ کتاب العالم والمتعلم کے نام سے ہے جسے مجلس احیائے معارف نعمانیہ حیدرآباد نے شائع کیا ہے، یہ رسالہ اگرچہ عقائد وکلام کے مباحث پر ہے لیکن وہ مباحث مکالمہ کے طریقہ سے متعلم وعالم کے سوال وجواب میں بیان کیے گئے ہیں اور اس سے متعلم کے طریق سوال وجواب اور معلم کے طریق افہام وتفہیم وشفقت ومحبت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایمان کے بعد علم ہی کو جگہ دی ہے چنانچہ کتاب الایمان

میں ایمانیات سے متعلق احادیث جمع کرنے کے بعد کتاب العلم میں علم کے متعلق احادیث اور اخبار و آثار جمع کیے ہیں جن سے علم کی فضیلت، علم و تعلیم کی اشاعت، تعلیم کے لیے تحریص و تشویق، عالم و متعلم کے فرائض اور طالب علموں کی تادیب وغیرہ کے مباحث اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

امام بخاری کی پیروی میں دیگر ارباب سنن و کتب احادیث نے بھی اپنی کتابوں میں کتاب العلم کے تحت یہ امور پیش کیے ہیں اور حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح فتح الباری میں معلومات بڑھائے ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ کو یہ شرف تقدم حاصل ہے کہ انہوں نے اصول علم و تعلیم، مفہوم علم، فضیلت طلب علم، آداب تعلم اور علما و طلبہ کے فرائض و اخلاق پر کتاب جامع بیان العلم وفضلہ میں تفصیلی مباحث پیش کیے اور احادیث و اخبار و آثار و اقوال سے استشہاد لائے، اس کا اختصار احمد بن عمر محمصانی بیروتی ازہری نے مختصر جامع بیان العلم وفضلہ کے نام سے کیا اور اسے ۱۳۲۰ھ میں مطبع موسوعات مصر سے شائع کیا ہے۔

امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ نے طریقہ درس و تدریس، فضیلت علم، اساتذہ و تلامذہ کے فرائض ان دونوں کی باہمی معاشرت کے آداب، احیاء العلوم میں قلم بند فرمائے ہیں اور علوم کی تقسیم کر کے ان کے درجات و امتیازات دکھائے ہیں، یہ مباحث احیاء العلوم جلد اول کتاب العلم اور جلد ثالث کتاب شرح عجائب القلوب میں مذکور ہیں۔

محمد بن ابوزید نے معلمین و متعلمین کے فرائض پر ایک کتاب لکھی تھی لیکن اس سراغ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس نے فن تعلیم پر جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ کتاب بھی اس کی ماخذ رہی ہے۔

علامہ ابن خلدون متوفی ۸۰۸ھ نے اپنے مقدمہ میں فن تعلیم پر ایک مستقل باب لکھا ہے اور بعض دوسری مناسبتوں سے اسی مقدمہ میں دوسرے مقاموں پر بعض تعلیمی

مباحث درج کیے ہیں اور ان میں علم و تعلیم کی ترقی کے اسباب و وجوہ اور تعلیم کے اصول و طریق پر فلسفیانہ نظریے قائم کیے ہیں۔

سیر و تراجم کی عام کتابوں جیسے وفیات الاعیان ابن خلکان، تذکرۃ الحفاظ ذہبی، طبقات الشافعیہ سبکی، حسن المحاضرہ سیوطی اور تاریخ تمدن کی کتابوں میں خطط مصر مقریزی وغیرہ میں مختلف ائمہ اور علما کے سوانح اور شہروں کے مدارس کے ذکر میں جستہ جستہ تعلیمی مباحث ملتے ہیں۔

فن تعلیم پر سب سے پہلی کتاب: یوں تو فن تعلیم پر مستقل حیثیت سے جو کتاب سب سے پہلے لکھی گئی وہ ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم قرار پا سکتی ہے لیکن اس کا یک گونہ تعلق تعلیم و تعلم کے ساتھ علما کے مقام علم و حقیقت فقہ و قیاس سے بھی ہے، اس لیے فن تعلیم پر سب سے پہلی مستقل کتاب جو خاص اسی موضوع پر تصنیف ہوئی، اسی مذکورۂ بالا رسالہ تعلیم المتعلم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

تعلیم المتعلم: یہ برہان الدین زرنوجی کی تصنیف ہے جو چھٹی صدی میں گذرے ہیں اور ہدایہ کے مشہور مصنف علامہ برہان الدین کے شاگردوں میں تھے، اس رسالہ میں تعلیم کا مقصد استادوں کے انتخاب، عالموں کی عزت، اسباق اور ان کی مقدار اور ترتیب اور علما اور طلبہ کے اخلاق و فرائض پر اختصار کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے اور علما اور ائمہ کے اقوال اور ان کی تعلیم و تعلیم کے واقعات سے مثالیں دی گئی ہیں۔

اس لیے اس رسالہ کو عام مقبولیت حاصل ہوئی، لاطینی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ ہونے کے علاوہ ترکی زبان میں بھی اسے شیخ عبدالمجید بن نصوح نے ارشاد الطالبین فی تعلم المتعلمین کے نام سے منتقل کیا اور ۹۹۶ھ میں شیخ ابراہیم بن اسماعیل نے اس کی شرح سلطان مراد ثالث کے زمانہ میں لکھی، ہندوستانی زبان میں بھی اس رسالہ کا ترجمہ الرفیق الفہیم لطریق التعلیم کے نام سے مولوی محمد معین الدین صاحب (محافظ کتب خانہ

حبیب گنج علی گڑھ) نے کیا ہے، یہ ۱۳۵۰ھ میں حبیب گنج علی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔

اصل رسالہ متعدد مرتبہ چھپ چکا ہے، جیسا کہ اوپر گذرا ۱۷۰۹ء میں جرمنی میں چھپا پھر ۱۸۲۸ء میں لائبزک میں، اس کے بعد ۱۲۶۵ھ میں ہندوستان میں شہر مرشد آباد میں چھاپا گیا، پھر ۱۹۰۱ء میں قازان میں، اس کے بعد ۱۲۸۶ھ میں تیونس میں ایک مختصر شرح کے ساتھ چھپا، پھر یہی تیونس کا نسخہ ۱۲۹۲ھ میں آستانہ میں چھاپا گیا، اس کے بعد ۱۳۰۷ھ میں پھر قازان میں چھپا اور ۱۸۹۸ء میں مصر میں پھر ۱۳۰۰ھ اور ۱۳۰۷ھ میں مطبوع ہوا(۱) علاوہ ازیں ابن اسماعیل کی شرح کے ساتھ بھی چھپتا رہا چنانچہ ۱۳۰۱ھ اور ۱۳۱۱ھ میں یہ قسطنطنیہ میں چھاپا گیا اور آخری اڈیشن ۱۳۳۴ھ میں مصر سے شائع ہوا۔(۲)

اس رسالہ کے ان بکثرت اڈیشنوں کی اشاعت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس فن کا مقبول عام رسالہ رہا ہے اور اب تک اہل علم کا اس فن میں اسی پر مدار تھا۔

تذکرة السّامع والمتكلم فی ادب العالم والمتعلم: لیکن اب حیدر آباد کی مجلس دائرۃ المعارف ہمارے شکریہ کی مستحق ہے کہ اس فن میں اس کی کوششوں سے ایک دوسری قابل قدر کتاب تذكرة السامع والمتكلم فی ادب العالم والمتعلم مولانا سید ہاشم صاحب ندوی کی عالمانہ تصحیح وتحشیہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس کتاب سے اس موضوع کے بہت سے قیمتی معلومات سامنے آگئے ہیں جن میں خصوصاً قدیم اسلامی تعلیم کے اصول کی تشریح کے ساتھ تحصیل علم کے طریقے، استادوں اور شاگردوں کے باہمی تعلقات، شاگردی کے آداب اور مدارس اور دارالاقامہ کے نظم ونسق اور رہنے سہنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر محشی نے اپنے حواشی میں سیر تاریخ، رجال اور حدیث کی مستند کتابوں سے ایسے بہت سے قیمتی معلومات نئے مذاق کے مطابق عنوانات قائم کرکے بڑھائے ہیں جن سے اسلامی عہد کی تعلیم کے طریقوں اور نظام کے مزید حالات سامنے آگئے ہیں۔

---

(۱) معجم المطبوعات العربیۃ جلد اص ۹۶۹۔ (۲) ایضاً ص ا اوا کتفاء القنوع ص ۱۹۰۔

تذکرۃ السامع، قاضی بدرالدین ابواسحاق محمد بن ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعہ کنانی معروف بہ قاضی ابن جماعہ متوفی ۷۳۳ھ کی تصنیف ہے، موصوف مصر وشام کے مختلف مقاموں پر قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہنے کے علاوہ کسی نہ کسی مشہور درسگاہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے پھر مصر میں صدر اساتذہ کے منصب پر سرفراز رہے (۱) اس لیے انھیں تعلیمی معاملات کا عملی تجربہ حاصل تھا اور انہوں نے جو کچھ لکھا وہ اپنے عملی تجربہ کے بعد لکھا ہے، ان کے بیان کا اسلوب یہ ہے جیسا کہ محشی نے دکھایا ہے کہ پہلے وہ اصول بیان کرتے ہیں پھر ان سے فروع نکالتے ہیں اس کے بعد موقع کے لحاظ سے واقعات اور اقوال نقل کرتے ہیں انہوں نے درس وتدریس کے طریقہ اور استادوں اور شاگردوں کے باہمی تعلقات میں جابجا ان کو مشورے دیے ہیں، وہ درس گاہوں میں مدرس تھے اور صدر اساتذہ کے منصب پر فائز تھے، اس لیے یہ بجا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ مشوروں کے طور پر لکھا ہے، ان پر اپنی نگرانی میں عمل بھی کرایا ہوگا، علاوہ ازیں انہوں نے اس میں متقدمین کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ اس کتاب میں متاخر مصنفین کے طرز تصنیف کے مطابق امام غزالی کی احیاء العلوم، ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم اور زرنوجی کی تعلیم المتعلم کی اصل عبارتیں جابجا نقل کی گئی ہیں، یہ کتاب پانچ بابوں پر تقسیم کی گئی ہے:

۱۔ علم اور اہل علم کی فضیلت۔

۲۔ اساتذہ کے آداب وتہذیب اپنی ذات کے متعلق اور اپنے شاگردوں کے ساتھ اور درس کے حلقہ میں۔

۳۔ طلبہ کے فرائض اور اخلاق اپنی ذات کے لیے اور اپنے استادوں اور

(۱) قاضی ابن جماعہ کے سوانح کی تفصیل کے لیے دیکھو، طبقات الشافعیہ سبکی جلد ۵ ص ۲۳۰، ۲۳۳، الدرر الکامنہ ابن حجر جلد ۳ ص ۲۸۰، ۲۸۲ شذرات الذہب ابن عماد حنبلی جلد ۶ ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

ساتھیوں کے ساتھ اور حلقۂ درس میں۔

۴۔ طلبہ اور ان کی کتابیں۔

۵۔ مدارس، مدرسین اور طلبہ آداب اور طریقے۔

تذکرۃ السامع کے حواشی: تذکرۃ السامع کے محشی نے بھی اپنے حواشی اور تعلیقات میں مصنف کے اسلوب بیان کی پیروی کی ہے اگر کتاب میں ایسے قواعد اور اصول نظر آئے، جنہیں مصنف نے لکھ کر کوئی مثال دیے بغیر چھوڑ دیا ہے تو ایسے موقعوں میں سے اکثر جگہ محشی نے مثالیں دے کر دکھایا ہے کہ اسلامی عہد میں ان پر عمل ہوتا تھا۔ کتاب میں درس و تدریس کے طریقے اور درس و تدریس کے حلقہ میں نشست و برخاست کے آداب کے ایسے بہت سے جزئی معلومات ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتے محشی نے مختلف کتابوں کے اقتباسوں سے ان کی مثالیں واضح کی ہیں۔

مقالہ کے مآخذ اور عنوان مباحث: اس لیے ضرورت تھی کہ اصل کتاب اور اس کے ان قیمتی حواشی کو نئی ترتیب اور اسلوب میں ہندوستانی زبان میں منتقل کیا جائے، حسن اتفاق کہ ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے اس اجلاس کے توسط سے اس کا موقع جلد ہاتھ آ گیا اور مناسب نظر آیا کہ ''اسلامی نظام تعلیم'' کے عنوان پر فن تعلیم کے متعلق تمام مذکورۂ بالا ماخذوں اور خاص طور پر تذکرۃ السامع اور اس کے حواشی (۱) سامنے رکھ کر چند مباحث حسب ذیل عنوانوں میں پیش کیے جائیں:

۱۔ اسلام کا تعلیمی نصب العین۔

۲۔ اسلامی نظام تعلیم کے تین دور۔

۳۔ نظام مدارس و دار الاقامہ۔

---

(۱) محشی نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور جن کے جابجا اقتباسات درج کیے وہ حسب ذیل ہیں: ۱۔ خطط مقریزی۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔ (بقیہ صفحہ ۱۱ پر) (تذکرۃ السامع حاشیہ ص ۳۹)

۴۔ اساتذہ کے فرائض۔

۵۔ طلبہ کے واجبات۔

۶۔ حلقۂ درس (کلاس)

۷۔ طریقۂ تعلیم و نصاب درس۔

۸۔ طرز تعلیم و نصاب درس کی چند خامیاں اور ان کی اصلاح کی کوششیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۰ کا)

۳۔ وفیات الاعیان ابن خلکان۔ ۴۔ الشقائق النعمانیہ طاش کبری زادہ۔ ۵۔ تعلیم المتعلم زرنوجی۔ ۶۔ احیاء العلوم غزالی۔ ۷۔ طبقات الشافعیہ سبکی۔ ۸۔ مختصر جامع بیان العلم ابن عبدالبر۔ ۹۔ ترمذی۔ ۱۰۔ ابن ماجہ۔ ۱۱۔ کنز العمال۔ ۱۲۔ ابوداؤد۔ ۱۳۔ صحیح بخاری۔ ۱۴۔ صحیح مسلم۔ ۱۵۔ فتح الباری ابن حجر۔ ۱۶۔ رحلۃ ابن بطوطہ۔ ۱۷۔ مفتاح السعادہ۔ ۱۸۔ فہرست کتب خانہ خدیویہ۔

راقم سطور نے ان ماخذوں کے ان اقتباسوں سے جو حواشی میں درج ہیں، فائدہ اٹھایا ہے، علاوہ ازیں ان کتابوں سے ایسے بہت سے نئے معلومات جو حواشی میں موجود نہ تھے، اصل کتابوں سے بڑھائے ہیں پھر اس مقالہ کی تسوید میں ذیل کی چند دوسری کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ رحلۃ ابن جبیر۔ ۲۔ معجم البلدان یاقوت حموی۔ ۳۔ مقدمہ ابن خلدون۔ ۴۔ معالم الایمان ابن ناجی۔ ۵۔ بغیۃ الوعاۃ سیوطی۔ ۶۔ صبح الاعشیٰ قلقشندی۔ ۷۔ الدرر الکامنہ ابن حجر۔ ۸۔ عیون الانباء ابن ابی اصیبعہ۔ ۹۔ استیعاب۔ ۱۰۔ مسند احمد بن حنبل۔ ۱۱۔ اسد الغابہ۔ ۱۲۔ الوافی بالوفیات صفدی۔ ۱۳۔ حسن المحاضرہ سیوطی۔ ۱۴۔ یعقوبی۔ ۱۵۔ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی۔ ۱۶۔ معجم المطبوعات العربیہ۔ ۱۷۔ اکتفاء القنوع۔ ۱۸۔ اکبر نامہ ابوالفضل۔ ۱۹۔ اخبار الاخیار۔ ۲۰۔ مقدمہ التربیۃ الاستقلالیہ۔ ۲۱۔ علمائے سلف۔ ۲۲۔ خیام۔ ۲۳۔ الغزالی۔ ۲۴۔ تاریخ صقلیہ۔ ۲۵۔ اسلامی نظام تعلیم۔ ۲۶۔ تاریخ التعلیم۔

اسلام کا تعلیمی نصب العین

اسلام نے علم اور دین دونوں کے دامنوں کو ایک دوسرے سے اس طرح باندھا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتا بلکہ قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت اِقْــرَأْ بِسْـمِ رَبِّكَ الَّـذِیْ خَـلَـقَ (اس کا نام لے کر پڑھ جس نے پیدا کیا) اسی حقیقت کو لے کر اتری ہے اور اشارہ سے بتاتی ہے کہ پیدا کرنے والے نے ہم کو پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لیے بنایا ہے۔

اسلام کی نظر میں تعلیم کا مقصد: اسلام کی نظر میں تعلیم و تعلم کا مقصد خالص رضائے الٰہی کی طلب اور بس اس میں کسی دنیاوی غرض کا میل نہیں بلکہ اس کی نظر میں تعلیم کا اصلی مقصد صرف انسانی پیدائش کے منشا کو پورا کرنا، اچھے اخلاق سے آپ آراستہ ہونا اور دوسروں کو آراستہ کرنا، اپنے علم کی روشنی سے جہل اور نادانی کے اندھیرے کو دور کرنا، نہ جاننے والوں کو سکھانا، بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانا، حق کو پھیلانا اور باطل کو مٹانا ہے۔

علم و علما کے فضائل قرآن مجید میں: یہی وجہ ہے کہ اسلام اہل علم کی خوبیاں اور بڑائیاں گنا کر ان کے مرتبے بڑھائے چنانچہ اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں علم، تعلیم اور علما کی بزرگی اور بڑائی بیان کی گئی ہے، سورۂ مجادلہ میں ہے:

یَرْفَعِ اللّٰـهُ الَّـذِیْـنَ اٰمَـنُـوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ۔ (ع۲)	تم میں سے جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا اللہ ان کے درجے بلند کرے گا۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ علما کو عام مسلمانوں پر سات سو درجہ زیادہ فضیلت دی گئی ہے اور ان درجوں کے باہمی فرق کے لیے ان میں ہر دو درجوں کے درمیان پانسو سال کی مدت کا فصل سمجھنا چاہیے۔

سورۂ آل عمران میں ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ۔ (ع۔۲)	اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے (گواہی دی) حاکم انصاف کا۔

اس آیت سے امام غزالی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا نام لیا پھر فرشتوں کا پھر اپنے سے تیسرا درجہ اہل علم کو عطا کیا اور یہ اہل علم کے شرف و فضیلت کی ایک نشانی ہے۔

سورۂ زمر میں ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (ع۔۱)	کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہوں گے۔

نحل میں آیا ہے:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ۔ (ع۔۵)	اہل ذکر سے پوچھو۔

امام غزالی نے اس آیت سے علم والوں سے تعلیم حاصل کرنے کی تلقین دکھائی ہے۔

سورۂ عنکبوت میں فرمایا:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ۔ (ع۔۵)	یہ مثالیں ہم نے لوگوں کے لیے بیان کیں اور انہیں سوائے علم والوں کے دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔

اس کے بعد اسی سورہ میں ارشاد ہوا:

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ.(ع ۵)

بلکہ جن لوگوں کو علم دیا گیا ان کے نزدیک تو (یہ قرآن) کی کھلی آیتیں ہیں اور ہماری نشانیوں سے سوائے ظلم کرنے والوں کے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

پھر سورۂ بینہ کی یہ آیت:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ، جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ.(ع ۱)

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے وہی لوگ بہترین خلائق ہیں، ان کا بدلہ ان کے پروردگار کے یہاں رہنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں سدا رہیں گے، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اس سے خوش یہ (اجر) اس کے لیے ہے جو خدا سے ڈرتا ہے۔

پڑھ کر سورۂ فاطر میں یہ ارشاد خداوندی ملاحظہ ہو:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں سے امام غزالی اور قاضی ابن جماعہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ علما ہی اللہ سے ڈرتے ہیں اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں وہ بہترین خلائق ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی شہادت کے رو سے علما بہترین خلائق ہیں۔ (۱)

علامہ زرنوجی نے حضرت آدم اور ملائکہ کے قصہ میں دکھایا ہے کہ

(۱) احیاء العلوم جلد ا ص ۴ و تذکرۃ السامع ص ۵،۶۔

انسان کا حقیقی شرف اس کا علم ہی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی کے ذریعہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فضیلت دی اور سجدہ کرنے کے قابل ٹھہرایا۔(۱)

علم و تعلیم اور تحصیل علم اور علما کے فضائل احادیث میں: حدیثوں میں بھی علم و علما کی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں اور انہیں دین کی خاطر علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، بخاری میں ہے:

"اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے"۔(۲)

عالم اور عابد کے موازنہ میں آپ نے فرمایا:

"عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہی ہے جیسے کہ مجھے تم میں سے سب سے معمولی آدمی پر فضیلت حاصل ہے"۔(۳)

تحصیل علم کی فضیلت میں ارشاد ہے:

"جس شخص نے ایک راستہ علم کی طلب میں طے کیا وہ جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلا"۔(۴)

امام غزالی اور ابن عبدالبر نے چند اور حدیثیں علم کی طلب کی فضیلت میں لکھی ہیں جن میں سے بعض بہت مشہور ہیں، جیسے طلب العلم فریضة علی کل مسلم اور یہ روایت "علی کل مسلم و مسلمة" یعنی علم کی طلب ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، اسی طرح ارشاد ہے:

"علم خزانے ہیں اور ان کی کنجی سوال ہے"۔

فرمایا:

"جاہل کو سزاوار نہیں کہ اپنی جہالت پر خاموش (قانع) رہے اور نہ عالم کو سزاوار

(۱) تعلیم المتعلم ص ۷۔ (۲) صحیح بخاری کتاب العلم جلد ا ص ۱۶۔ (۳) ترمذی ص ۳۲۵۔ (۴) بخاری جلد ا ص ۱۶ اور ترمذی۔

ہے کہ وہ اپنے علم کے باوجود خاموش رہے"۔

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"ایک عالم کی مجلس کی حاضری ایک ہزار رکعت نمازوں، ایک ہزار مریضوں کی عیادت اور ایک ہزار جنازوں کی شرکت سے افضل ہے"۔

اس پر پوچھا گیا کہ اور "قرآن مجید کی تلاوت سے؟" تو آپ نے فرمایا:

"کیا قرآن علم کے بغیر نفع پہونچا سکتا ہے؟"۔

آپ نے فرمایا:

"اگر کسی ایسے شخص کو موت آئی جو ایسے علم کی طلب میں تھا جس سے اسلام کو زندگی عطا ہو تو اس کے اور رسولوں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا"۔

حضرت معاذ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے ان سے فرمایا:

"اگر تمہارے ذریعہ سے ایک شخص نے ہدایت پائی تو یہ تمہارے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے"۔

آپ نے فرمایا:

"جس نے علم کا ایک باب اس لیے پڑھا کہ لوگوں کو تعلیم دے تو اسے ستر صدیقین کا ثواب عطا ہوا"۔

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا:

"کیا ہی عمدہ عطیہ اور عمدہ ہدیہ ہے، حکمت کا ایک وہ کلمہ جسے تم نے سنا اور محفوظ رکھا پھر اسے اپنے بھائی تک پہونچایا اس کا سکھانا مسنون عبادت کے برابر ہے"۔

آپ نے ایک مرتبہ فرمایا:

"میرے جانشینوں پر خدا کی رحمت ہو"۔

سوال کیا گیا کہ آپ کے جانشین کون ہیں؟ تو ارشاد ہوا:

''وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ کریں گے اور اللہ کے بندوں کو اس کی تعلیم دیں گے''۔(۱)

آپ نے فرمایا:

''بندہ دین میں فہم حاصل کرنے سے زیادہ کسی دوسری چیز کی وجہ سے افضل نہیں، ایک فقیہ ہزار عامیوں سے زیادہ شیطان کے لیے سخت ہوتا ہے''۔(۲)

نیز فرمایا:

''قیامت کے دن تین گروہوں کے لوگ شفاعت کریں گے، انبیاء پھر علما پھر شہدا''۔

اسی طرح روایت ہے:

''جس نے ایک عالم کی عزت کی اس نے ستر نبیوں کی عزت کی اور جس نے ایک طالب علم کی عزت کی اس نے ستر شہیدوں کی توقیر کی''۔

ایک روایت میں ہے:

''جس نے عالم کے پیچھے نماز پڑھی اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی اور جس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی اسے مغفرت حاصل ہوئی''۔(۳)

علما کی شان میں سب سے مشہور حدیث یہ ہے:

العلماء ورثة الانبياء علما انبیاء کے وارث ہیں۔

علامہ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اسے ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان

(۱) احیاء العلوم جلد ا ص ۶، ۷ و مختصر جامع بیان العلم ص ۹ تا ۲۲۔ (۲) ترمذی، ص ۳۴۴ و ابن ماجہ ص ۲۰۔

(۳) یہ حدیثیں ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام غزالی نے احیاء العلوم میں اور قاضی ابن جماعہ نے تذکرۃ السامع میں نقل کی ہیں اور ان میں سے اکثر کنز العمال جلد ۵ ص ۲۰۴ کتاب العلم میں موجود ہیں۔

اورحاکم نے روایت کیا ہے اور امام بخاری نے ترجمہ باب میں اسے جگہ دے کر اس کی صحت تسلیم کر لی ہے اور اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۱)

پھر ہم نے کتاب ان لوگوں کے درمیان وراثت چھوڑی، جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا ہے۔

نیز امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی دوسری کتاب تاریخ کبیر میں متعدد سندوں سے نقل کیا ہے اور ابوداؤد اور ابن ماجہ میں اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت موجود ہے۔ (۲)

علم اور تحصیل علم کی فضیلت میں صحابہ اور تابعین وعلمائے اسلام کے آثار واقوال: علم اور علما کی فضیلت میں صحابہ، تابعین اور علمائے اسلام کے بہ کثرت آثار واقوال مروی ہیں، حضرت معاذ بن جبلؓ تحصیل علم کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''علم سکھاؤ اس لیے کہ علم کا سکھانا نیکی ہے اور اس کا طلب کرنا عبادت ہے اور اس کا مذاکرہ کرنا تسبیح اور اس پر بحث کرنا جہاد، اس کا خرچ کرنا تقرب الٰہی کا ذریعہ اور نہ جاننے والے کو بتانا صدقۂ جاریہ ہے''۔ (۳)

حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

''علم کا ایک باب جو ہم پڑھتے ہیں، وہ میرے نزدیک نفل کی ایک ہزار رکعتوں سے زیادہ پسندیدہ ہے اور علم کے ایسے باب کا پڑھنا جس پر ہم عمل بھی نہ کرسکیں؟ تو وہ بھی سو رکعتوں کے پڑھنے سے بہتر ہے''۔

حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ:

---

(۱) فتح الباری جلد ۱ ص ۸۳۔ (۲) حاشیہ تذکرۃ السامع ص ۷۔ (۳) ابوداؤد جلد ۲ ص ۷۷ وابن ماجہ ص ۱۷۔

"فقہ کی ایک مجلس ساٹھ سال کی عبادت سے زیادہ فضیلت رکھتی ہے"۔(۱)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت کمیلؓ سے فرمایا:

"اے کمیل! علم دولت سے بہتر ہے، علم پاسبانی کرتا ہے اور دولت کی پاسبانی تمہیں کرنی پڑتی ہے اور علم حکمراں ہوتا ہے اور دولت پر حکمرانی کی جاتی اور دولت خرچ ہونے سے کم ہوتی ہے اور علم خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے"۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ اثر بھی منقول ہے کہ:

"عالم، روزہ دار، زاہد اور مجاہد سے افضل ہے، جب کوئی عالم وفات پاتا ہے تو اسلام میں ایک روزن ہو جاتا ہے جو اس کے قائم مقام کے آنے کے بعد بند ہوتا ہے"۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:

"حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو علم، دولت اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا، انہوں نے علم کو منتخب کیا تو دولت وسلطنت بھی اس کے دامن سے وابستہ ہاتھ آئی"۔

فتح موصلیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ اگر مریض کھانے پینے اور دوا کھانے سے روک دیا جائے تو وہ مر نہ جائے گا؟ لوگوں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے فرمایا:

"یہی قلب کا حال ہے، اگر اسے تین دن علم وحکمت سے روک دیا جائے تو وہ مردہ ہو جائے گا"۔

زبیر بن ابوبکر کہتے ہیں کہ ان کے والد نے انہیں یہ نصیحت لکھ بھیجی کہ:

"لازم ہے کہ تم علم کی طلب کرو، کیوں کہ اگر تم فقیر ہو گئے تو علم تمہاری

---

(۱) دار قطنی و کنز العمال جلد ۵ ص ۲۰۸۔

دولت ہوگا اور اگر تم مالدار ہوئے تو علم تمہارا حسن و جمال بنے گا''۔

ابن مبارک فرماتے ہیں:

''مجھے اس شخص پر تعجب آتا ہے جو علم حاصل نہیں کرتا اس کے باوجود اپنے کو عزت کیے جانے کا مستحق سمجھتا ہے''۔

حضرت ابودرداؓ فرماتے ہیں:

''اگر میں ایک مسئلہ کی تعلیم حاصل کروں تو یہ میرے نزدیک رات بھر نماز پڑھنے سے بہتر ہے''۔

حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں:

''علم کی ایک مجلس لہو ولعب کی ستر مجلسوں کا کفارہ ادا کرتی ہے''۔

امام شافعیؒ نے فرمایا:

''علم کی تحصیل نفل پڑھنے سے افضل ہے''۔

ابن عبدالحکم کا بیان ہے کہ وہ امام مالک کے پاس تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھے، جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو انہوں نے نماز میں جانے کے لیے اپنی کتابیں سمیٹیں، اس وقت امام مالک نے فرمایا:

''جس چیز کے لیے تم جس چیز کو چھوڑ کر اٹھ رہے ہو، وہ اس سے افضل نہیں، اگر علم کی تحصیل کی نیت درست ہے''۔(۱)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

''انسانوں کو خیر کی تعلیم دینے والے کے لیے ہر چیز دعا کرتی ہے، یہاں تک کہ مچھلی بھی سمندر میں دعا گوئی میں مصروف رہتی ہے''۔

بعض بزرگوں کا قول ہے:

(۱) احیاء العلوم جلد ۱ ص ۵ تا ۷۔

"علما زمانوں کے چراغ ہیں۔ان میں سے ہر عالم اپنے اپنے زمانہ کے لیے روشنی ہے جس سے اس کے زمانہ کے لوگ روشنی حاصل کرتے ہیں"۔

حضرت عکرمہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ کہا کہ علم کی قیمت ہوتی ہے، پوچھا گیا وہ کیا ہے تو فرمایا:

"اسے اس شخص کو دو جو اسے عمدہ طریقے سے اٹھائے اور ضائع نہ کرے"۔(۱)

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں:

"اللہ کے نزدیک عزت میں سب سے بڑھے ہوئے وہ ہیں جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہیں اور وہ انبیاء اور علما ہیں"۔

نیز انہوں نے فرمایا:

"نبوت سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں اور نبوت کے بعد علم کا درجہ ہے"۔

سہل کہتے ہیں:

"جو انبیاء کی مجلسیں دیکھنے کی آرزو رکھتا ہو وہ علما کی مجلسوں میں بیٹھے، ان کی مجلسیں انبیاء کی مجالس کا نمونہ ہیں"۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

"اگر باعمل علما اللہ کے اولیا نہیں تو پھر اللہ کا کوئی ولی نہیں ہے"

امام سفیان ثوری اور امام شافعی سے منقول ہے کہ:

"فرائض کی ادائی کے بعد علم کی طلب سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں"۔

قاضی ابن جماعہ ان آثار و اقوال کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ان سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے علم میں مشغول رہنا نفل کی بدنی عبادتوں نماز، روزہ، تسبیح اور دعا وغیرہ سے بہتر ہے، کیوں کہ اس کے علم کا نفع اس شخص کو حاصل ہونے کے علاوہ دوسرے لوگوں تک

(۱) احیاء العلوم جلد ا ص ۷،۵۔

بھی پہونچے گا اور جسمانی عبادتوں، نفل نمازوں اور وظیفوں وغیرہ کا نفع صرف اس کی ذات تک محدود رہے گا، بلکہ عالم کے علم سے اس کی وفات کے بعد بھی نفع پہونچنا ممکن ہے اور علامہ ابن عبدالبر نے اس موقع پر اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ مرنے کے بعد سب کے عمل کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، سوائے تین قسم کی چیزوں کے، ایک صدقہ جاریہ، دوسرے ایسا علم جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی نفع ہو اور تیسرے صالح لڑکے جو اس کے حق میں بھلائی کی دعا کریں لیکن عابد کی عبادت سے صرف اس کی ذات کو نفع پہونچتا ہے۔(۱)

اس بزرگی اور بڑائی کا مصداق بننے کے لیے بعض شرطیں: لیکن اسلام نے علم کی ان بزرگیوں اور عزتوں سے صرف ان علما کو مشرف کیا ہے جو علم کے ساتھ اپنے دامن میں عمل کا ذخیرہ رکھتے ہوں چنانچہ قاضی ابن جماعہ علم اور علم والوں کی فضیلتیں بیان کرنے کے بعد علم حاصل کرنے والے کے لیے ذیل کی شرطیں لکھتے ہیں:

۱۔ علم اور علما کی یہ فضیلتیں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو علم کے ساتھ عمل کے زیور سے بھی آراستہ ہوں اور ان کے علم حاصل کرنے کا حقیقی مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنا ہو"۔

۲۔ علم کی طلب کسی بری نیت سے نہ ہو۔

۳۔ علم کی طلب میں دنیاوی غرضیں، جاہ، منزلت، دولت، ثروت، ناموری اور پیشوا بننے کی ہوس شامل نہ ہو، کیوں کہ اسلام میں علم کے جہاں وہ فضائل گنائے گئے ہیں، اسی کے ساتھ بری خواہشوں اور دنیاوی غرضوں سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے،(۲) ترمذی کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص علم اس غرض سے حاصل کرے کہ وہ اس کے ذریعہ سے بیوقوفوں سے بحث ومباحثہ کرے یا اس کی طرف لوگ عقیدت سے جھکیں تو اللہ اس شخص

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۳ اومختصر جامع بیان العلم ص ۱۴۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۱۳۔

کو دوزخ میں داخل کرے گا''۔

دوسرے لفظوں میں ارشادِ نبویؐ ہے:

''جس شخص نے علم خدا کے سوا کسی دوسرے کے لیے حاصل کیا اور خدا کے علاوہ اس کی طلب میں کوئی دوسری غرض شامل رہی ہو تو خدا جہنم میں اس کا ٹھکانا بنائے گا''۔(۱)

اسی طرح آپؐ نے فرمایا:

''جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی مرضی حاصل کی جاتی ہے، اس لیے حاصل کیا کہ اس سے اپنی کوئی (دنیوی) غرض حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا''۔(۲)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''پہلا شخص جس کا قیامت کے دن فیصلہ کیا جائے گا (اور راوی نے تینوں شخصوں کا ذکر کیا اور ان میں) وہ شخص ہے جس نے علم سیکھا اور اس کو سکھایا اور قرآن پڑھا تو اس کو لایا جائے گا، اور خدا اس پر اپنے احسانات جتائے گا اور وہ ان کو تسلیم کرے گا، پھر خدا کہے گا کہ تم نے اس سے کیا کام لیا، وہ کہے گا کہ میں نے تیرے لیے علم سیکھا اور سکھایا، تیرے لیے قرآن پڑھا، خدا کہے گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تو نے اس لیے علم سیکھا کہ یہ کہا جائے کہ تو عالم ہے اور تو نے قرآن اس لیے پڑھا کہ یہ کہا جائے کہ تو قاری ہے، پھر اس کے متعلق حکم دیا جائے گا اور وہ منہ کے بل گھسیٹتا ہوا لایا جائے گا، یہاں تک کہ آگ میں ڈال دیا جائے گا۔(۳)

(۱) ترمذی ص ۳۲۱۔ (۲) ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۸۔ (۳) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۴۰۔

اخلاق وسیرت کی تربیت

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے تعلیمی نصب العین کی تکمیل کے لیے یہ ضروری تھا کہ طالب علموں میں نیک سیرت اور عمدہ اخلاق پیدا کیے جائیں چنانچہ مشہور علما کے ایسے بہت سے اقوال ہیں جن میں طلبہ کو بلند اخلاق کے حصول کی تلقین کی گئی ہے، ابومرزوق حبیب بن شہید متوفی ۱۰۹ھ اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں:

"بیٹا (حصول علم کے ساتھ) عالموں اور فقیہوں کی صحبت اختیار کرو، ان سے تعلیم حاصل کرو، تہذیب وشائستگی سیکھو، یہ میرے نزدیک زیادہ باتیں بنانے سے بہتر ہے"۔

ابن سیرین فرماتے ہیں:

"لوگ جیسے علم حاصل کرتے تھے، ویسے ہی سیرت اور اخلاق بھی حاصل کرتے تھے"۔

سفیان بن عیینہ کا ارشاد ہے:

"آنحضرت ﷺ سب سے بڑی ترازو ہیں، چیزیں آپ ہی کے خلق اور سیرت پر تولی جائیں، جو چیزیں آپ سے مطابق نکلیں وہ حق ہیں اور جو آپ سے مخالف ہوں وہ باطل ہیں"۔

بعض بزرگوں کا قول ہے کہ:

''تہذیب اور حسن ادب کا ایک باب پڑھنا علم کے ستر بابوں کے پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے''۔

حضرت مخلد بن حسین ابن مبارک سے فرماتے ہیں:

''ہم لوگ حدیثیں زیادہ حاصل کرنے کے بجائے حسن ادب کے زیادہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں''۔(۱)

طلبہ کو اسلام کے تعلیمی نصب العین کی تلقین: اہل علم و اساتذہ طالب علموں کو اسلام کی ان تعلیموں کے مطابق انہیں اپنا تعلیمی نصب العین مقرر کرنے کی ہدایت کرتے تھے چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے اسے استادوں کے فرائض میں شمار کیا ہے کہ وہ طلبہ کو اپنے قول و عمل سے حسن نیت اور اخلاص عمل اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہیں، انہیں علم کی فضیلتیں بتائیں اور اچھے مستقبل کی امید دلائیں اور ان کے سامنے ان کے علم حاصل کرنے کا مقصد بیان کریں کہ:

''وہ اپنی تعلیم اور تہذیب کا مقصد اللہ تعالی کی مرضی حاصل کرنا، علم کی اشاعت کرنا، شریعت کو قائم کرنا، حق بات زبان سے نکالنا اور ناحق باتوں کو روکنا قرار دیں......(ورنہ) اگر نیک نیتی سے علم حاصل نہیں کیا گیا تو اس علم سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں کیوں کہ حسن نیت ہی سے علم میں برکت حاصل ہونے کی امید کی جاتی ہے''۔

پھر دوسرے موقع پر طالب علموں سے کہتے ہیں کہ:

''طلبہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے دل کو ہر قسم کی کھوٹ کپٹ، عداوت، کینہ، بد خلقی اور بدعقیدگی سے پاک رکھیں تا کہ اس میں علم کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، اس کی باریکیاں دل میں اتر سکیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا علم باطن کی

(۱) تذکرۃ السامع از ص ۲ تا ۱۴۔

نماز اور دل کی عبادت ہے اس لیے جس طرح ظاہر کی عبادت، طہارت کے بغیر قبول نہیں، اسی طرح باطنی عبادت بھی دل کی پاکی کے بغیر درست نہ ہوگی، حدیث میں آیا ہے کہ: ''جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہے تو جسم بھی تندرست ہے اور اگر اس میں خرابی آئی تو سارجسم خراب ہوگیا، آگاہ رہو کہ وہ دل ہے۔''

(بخاری کتاب الایمان جلد ا ص ۱۳)

سہل کہتے ہیں: ''قلب میں اس وقت تک روشنی نہیں پہونچ سکتی جب تک اس میں کوئی ایسی چیز موجود ہو جو خدا کو پسند نہیں ہے''۔

اس کے بعد قاضی ابن جماعہ طالب علموں کو حسن نیت اور اخلاص کے متعلق لکھتے ہیں:

''پھر طالب علم کے لیے علم کی طلب میں دوسری شرط اس کی نیت کا خالص ہونا ہے، اسے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ علم کے حاصل کرنے کا مقصد خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کی جستجو، اس کے حکموں پر عمل، شریعت کو زندہ، دل کو روشن اور باطن کو اجاگر کرنا ہے''۔(۱)

اسی طرح زرنوجی کہتے ہیں:

''طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحصیل علم سے رضائے الٰہی اور دار آخرت کی طلب، جہل کے ازالہ، احیائے دین اور ابقائے اسلام کی نیت رکھے''۔(۲)

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی نیت سے زیادہ کسی دوسری چیز کی نگرانی نہیں کی کہ علم کی تحصیل

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۴۷، ۴۸، ۶۸، ۶۹، امام غزالی نے احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم میں اسے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ (۲) تعلیم المتعلم ص ۱۴۔

کی غرض میں دنیاوی اغراض، جاہ ومنزلت کی خواہش، دولت وثروت کی ہوس، ہمعصروں اور دوستوں میں سربلندی کی تمنا، لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کا خیال شامل نہ ہو جائے، کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو عمدہ چیز کے بدلہ میں معمولی چیز لی جائے گی"۔

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"لوگو! اپنے علم سے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حاصل کرنے کی نیت رکھو، میں جب کبھی کسی مجلس میں اس نیت سے بیٹھا کہ خاکسار اور متواضع رہوں گا تو ہمیشہ اس مجلس سے سربلند ہو کر اٹھا اور جب کبھی میری نیت میں فتور آیا اور ہم چشموں میں سربلند ہونے کا تصور دل میں آیا تو مجھے اس مجلس سے رسوا ہو کر اٹھنا پڑا، علم بھی عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے"۔(۱)

نصب العین کی بلندی سے نظر کی بلندی: اسلام کے اس بلند تعلیمی نصب العین کا یہ اثر تھا کہ اس دور کے اہل علم نے بڑی بلند نظر پائی تھی اور اپنی زندگی بڑے استغنا اور قناعت سے گذارتے تھے اور اپنے علم کی عزت خود کرتے تھے، وزیر جعفر برمکی عیسیٰ بن یونس مقری کے متعلق کہتا ہے:

"میں نے قاریوں میں عیسیٰ بن یونس کے مثل کسی کو نہیں دیکھا، ان کے سامنے ایک لاکھ درہم پیش کیے گئے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ خدا کی قسم اہل علم یہ نہ کہہ سکیں کہ میں نے سنت کی اشاعت کرنے کی قیمت کھائی ہے"۔

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر مامون نے دس ہزار ان کی خدمت میں پیش کیے لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔(۲)

سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ:

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۶۸، ۶۹۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۵۸۔

"مجھے قرآن کا فہم عطا کیا گیا تھا لیکن جب میں نے ابوجعفر (المنصور متوفی ۱۵۸ھ) سے تھیلی لے لی تو وہ فہم مجھ سے چھین لیا گیا، ہم اللہ سے مسامحت پر عفو چاہتے ہیں"۔(۱)

بعض شبہات کا ازالہ اور اسلام میں دیگر علوم کی اہمیت: اسلام کے اس تعلیمی نصب العین سے یہ شبہہ نہ ہو کہ اسلام نے دوسرے دنیاوی علوم جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت پڑتی اور جن پر انسانی معاشرت، عمرانی ضرورت اور جسمانی آسایش کا مدار ہے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک اپنے خطبہ میں کہتے ہیں کہ:

"آٹھویں صدی (دوسری صدی ہجری) میں اسلامی دنیا کے ایک سربرآوردہ عالم کا ذکر ہے کہ اس نے بڑے تذبذب کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا کہ فقہ کے علاوہ جس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے اور جو روحانی صحت کا باعث ہے، طب بھی علم کی ایک شاخ ہے، جس سے جسمانی صحت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے، ان کے علاوہ اس نے باقی سب علوم کو تفنن طبع کا سامان قرار دیا"۔

یہ شبہ اسلام کے اسی بلند نصب العین کی غلط تاویل سے پیدا ہوا ہے، درحقیقت اسلام کے اس بلند نصب العین کا تعلق علم اور تعلیم کے مقصد اعلیٰ سے ہے، ورنہ اس نے نہ صرف ہمیں دنیاوی، عمرانی، اجتماعی اور معاشرتی ضرورتوں کے لیے دوسرے علموں کے حاصل کرنے کی اجازت دی بلکہ بعض موقعوں پر ہمت افزائی کی ہے اور ان کے تعلیم و تعلم میں دینی حیثیت سے کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھی ہے، ارشاد نبوی ہے:

انتم اعلم باموردنیاکم تم اپنے دنیاوی امور کے زیادہ جاننے والے ہو۔

وعید کی ان حدیثوں میں بھی جن میں علم کی تحصیل میں دنیاوی غرض کے وابستہ کرنے کی مذمت کی گئی ہے، یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ مومن کی ہر حرکت وجنبش خداوند تعالیٰ

(۱) تذکرۃ الحفاظ۔

کے خوشنودی ہی کے ماتحت رکھی گئی ہے اور ہر کام میں اصل مدار انسانوں کی نیتوں پر رکھا گیا ہے اس لیے اگر کسی دنیوی سے دنیوی علم کی تحصیل بھی مثلاً مخلوق خدا کو فائدہ اور شہر اور وطن کے لوگوں کو آرام پہنچانے اور اہل وعیال کی پرورش کرنے کے لیے اس نیت سے کی جائے کہ ان کے حقوق ادا کر کے اور انھیں فائدہ پہونچا کر حکم خداوندی بجالانے کی توفیق حاصل ہوگی تو بارگاہ الٰہی سے اسے مقبولیت کی سند عطا ہوگی اور وہ آخرت میں اجر پانے کا مستحق ہوگا، احادیث میں اس مفہوم کی مختلف روایتیں ہیں، مثلاً اگر کسی شخص نے اپنے بچہ کے منہ میں ایک لقمہ بھی اس نیت سے ڈالا کہ حکم خداوندی پورا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کا اجر اسے عطا فرمائے گا، ایک حدیث میں ہے کہ "بہت سے ایسے عمل جو دنیاوی معلوم ہوتے ہیں وہ حسن نیت سے اخروی اعمال بن جاتے ہیں اور بہت سے عمل جو دینی نظر آتے ہیں وہ نیت کی برائی سے دنیاوی بن جاتے ہیں"۔

علاوہ ازیں وعید کی ان حدیثوں میں سے ابوداؤد میں جو حدیث مروی ہے اس کے متن کے الفاظ یہ ہیں:

من تعلم علماً مما ینبغی به	جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی
وجه الله تعالیٰ لا یتعلمه الا	مرضی حاصل کی جاتی ہے، اس لیے
لیصیب به غرضاً من الدنیا	حاصل کیا کہ اپنی کوئی دنیوی غرض
لم یجد عرف الجنة یوم	حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن
القیامة.	جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔

اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ یہ تمام وعیدیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو اشرف علوم یعنی علم دین کی تحصیل میں مصروف ہوں اور اس سے ان کی کوئی دنیاوی غرض وابستہ ہو، اس لیے معلوم یہ ہوا کہ صرف علم دین کا کسی دنیاوی غرض سے حاصل کرنا اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے، ورنہ جہاں تک دوسرے دنیاوی علموں کا تعلق ہے بعض اوقات علما

نے ان کی تحصیل مسلمانوں پر فرض کفایہ کے طور پر عائد کی ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم میں یہ نکات تفصیل سے دکھائے ہیں چنانچہ حدیث نبوی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم اور اطلبوا العلم ولو کان باالصین پیش کر کے جس علم کی تحصیل ہر مسلم پر فرض ہے اس کو دکھا کر "اس علم کا بیان جس کی تحصیل فرض کفایہ ہے" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

علوم کی اولاً دو قسمیں ہیں (۱) علوم شرعیہ (۲) علوم غیر شرعیہ۔

علوم شرعیہ سے میری مراد وہ علوم ہیں جو انبیائے کرام علیہم الصلوات سے براہ راست حاصل ہوتے ہیں، ان کی طرف عقل کی رہنمائی اس طریقہ سے نہیں ہو سکتی، جیسے عقل کے ذریعہ علم حساب سیکھا جاتا ہے، نہ وہ تجربہ سے حاصل ہو سکتے ہیں، جیسے علم طب کی تدوین ہوتی ہے اور نہ محض سننے سے ان کا حاصل کرنا ممکن ہے، جیسے علم لغت حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد جو علوم غیر شرعیہ ہیں، ان میں بعض پسندیدہ ہیں اور بعض ناپسندیدہ اور بعض ایسے جو صرف درجہ مباح رکھتے ہیں:

۱۔ علوم پسندیدہ وہ ہیں جن سے دنیاوی امور کی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں، جیسے علم طب اور حساب وغیرہ، پھر ان علوم پسندیدہ میں اپنے درجوں کے لحاظ سے بعض ایسے ہیں جن کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، بعض ایسے ہیں جنہیں حاصل کرنا افضل ہے اور بعض ایسے ہیں جن کو حاصل کیا جا سکتا ہے مگر ان کی تحصیل فرض نہیں ہے۔

پھر ان میں سے فرض کفایہ ہر وہ علم ہے جس سے ہم دنیاوی زندگی اور کاروبار کے قائم اور باقی رکھنے میں بے پروا نہیں ہو سکتے، جیسے علم طب ہے کہ اس کی تحصیل صحت کے باقی رکھنے کے لیے لازمی ہے، یا علم حساب ہے کہ مختلف معاملوں، وصیتوں اور ترکہ کی تقسیم میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کوئی شہر

ان علموں کے جاننے والوں سے خالی ہو جائے تو شہر والوں کو وقت پیش آئے گی اور جب کوئی ایک شخص بھی ان کا جاننے والا ان کے درمیان پیدا ہو جائے تو اس کے ذریعہ سے شہر کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، اس لیے یہ فرض اس کی موجودگی میں دوسروں کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، اسی طرح مختلف پیشے کاشتکاری، باغبانی، پارچہ بافی، سائیسی، حجامت اور خیاطی وغیرہ ہیں کہ اگر ان میں سے کسی پیشہ والے سے کوئی شہر خالی ہو جائے تو زحمت پیش آئے اور بعض پیشہ والوں کی عدم موجودگی میں ہلاکت تک کی نوبت آ جائے، پس جس نے بیماری اتاری اس نے دوا بھی بتائی اور ان کے استعمال کے طریقے بتائے اور ان کے مہیا کرنے کے اسباب پیدا کیے، اس لیے ان پیشوں کو چھوڑنا جائز نہ ہوگا۔

اور بعض علوم جن کا حاصل کرنا اگر چہ فرض نہیں مگر افضل ہے وہ جیسے علم حساب وطب میں باریکیاں پیدا کرنا ہے کہ انسان ان سے مستغنی ہو سکتا ہے لیکن ان کی تحصیل سے فائدہ پہونچنے کے پہلوؤں میں اضافہ ہوتا ہے۔

ناپسندیدہ علوم میں سحر، شعبدہ بازی اور نظر بندی وغیرہ ہیں اور علم مباح میں جیسے ایسے اشعار کا پڑھنا جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ وغیرہ سے دلچسپی رکھنا ہے۔(۱)

پھر امام غزالیؒ نے بھی ایک دوسرے موقع پر بھی ''علم'' کے مصداق میں مختلف علموں اور پیشوں کو داخل کیا ہے ان کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے کہتے ہیں:

''جب علم تمام امور میں افضل ہے تو اس کا حاصل کرنا افضل چیز کا حاصل کرنا ہے اور اس کی تعلیم دینا افضل چیز کا مہیا کرنا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ

(۱) احیاء العلوم جلد ا۔

انسان کی پیدائش کے مقاصد دین اور دنیا دونوں کے مجموعہ پر مشتمل ہیں، کیونکہ دین کا نظام جب تک دنیاوی نظام قائم نہ ہو، قائم نہیں ہوسکتا اور امر دنیاوی کا انتظام انسانوں کے کاموں اور پیشوں پر موقوف ہے اور انسانی پیشے تین قسم کے ہیں۔

(۱) ایسے پیشے جو عالم کے قیام کے لیے بنیاد کے طور پر ہیں اور وہ چار ہیں:
۱۔ زراعت انسان کی غذا لیے۔ ۲۔ پارچہ بافی تن پوشی کے لیے۔ ۳۔ تعمیر سکونت کی جگہ کے لیے۔ ۴۔ اور سیاست خاندان اور ملک کے انتظام اور معیشت کے اسباب کے مہیا کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کے لیے۔

(۲) دوسرے وہ پیشے جو ان چاروں پیشوں کے لیے آلات اور وسیلے مہیا کریں، جیسے لوہاری اور ندافی (دھنائی) وغیرہ۔

(۳) تیسرے وہ پیشے ہیں جو پہلی قسم کے پیشوں کو مدد پہونچائیں، جیسے کھانا پکانے اور سینے پرونے وغیرہ کے پیشے۔

ان سب پیشوں میں پہلی قسم کے پیشوں کو فضیلت حاصل ہے اور ان میں سے بھی سب سے افضل سیاست کا پیشہ ہے جس سے نظم اور ضبط کا وجود عمل میں آتا ہے اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی اصلاح کی جاتی ہے اور انہیں حق کی راہ دکھائی جاتی ہے۔

پیشۂ سیاست کے چار درجے قرار پاسکتے ہیں:

۱۔ پہلے درجہ میں انبیائے کرام کی سیاست ہے جو وہ اپنے پیغاموں سے خلق کی رہبری فرماتے ہیں۔

۲۔ دوسرا درجہ خلفا اور سلاطین کو حاصل ہے، ان کے احکام عوام وخواص پر نظم وانتظام کے لیے جاری ہوتے ہیں لیکن ان کی حکومت ظاہر پر ہوتی ہے، باطن

پر نہیں۔

۳۔ تیسرے علمائے کرام ہیں، یہ انبیائے کرام کے وارث ہیں، ان کی حکومت لوگوں کے دلوں پر ہوتی ہے اور یہ باطن کی اصلاح کرتے ہیں۔

۴۔ چوتھے واعظ ہیں جو صرف عوام کی اصلاح کرتے ہیں۔

پس ان پیشوں میں سب سے بڑھ کر پیشہ نبوت کے بعد علم کا فائدہ پہونچانا اور لوگوں کو تہذیب اور اخلاق سکھانا ہے اور یہی فن تعلیم کا حقیقی مقصود ہے۔(۱)

اس کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے علم دین کے حاصل کرنے والوں کے لیے یہ بھی جائز نہ تھا کہ وہ اس علم کی فضیلت پر ناز کر کے دوسرے غیر شرعی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھیں کیونکہ دنیاوی زندگی میں ان علوم کی ضرورتیں مسلم تھیں، امام غزالی نے اس مبحث پر اس لحاظ سے بھی گفتگو کی ہے اور نتیجہ کے طور پر دکھایا ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدوں سے دی جاسکتی ہے جو جہاد کے میدان میں اپنا سر ہتھیلی پر لیے دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے والوں کی مثال فوج کے اس دستہ سے دی جائے گی جو سرحدی قلعوں پر سرحد کی حفاظت کے لیے متعین ہوتا ہے۔(۲)

علم کی تعلیم و تحصیل انسانی فطرت میں طبعی ہے: دوسری طرف علمائے اسلام میں سے ابن خلدون نے تعلیم و تحصیل کے فن کو تمدنی زندگی میں انسانی طبیعت کے لیے فطری قرار دیا ہے وہ لکھتا ہے:

"انسان تمام حیوانوں سے اپنی حیوانیت میں حس، حرکت اور غذا کے لحاظ سے مشارکت رکھتا ہے، اسے حیوانوں سے جو امتیاز حاصل ہے وہ اس کی قوت فکر کی وجہ سے ہے، اس کے ذریعہ سے وہ اپنی معاش کی تحصیل اور اپنے ابنائے جنس سے اس کے حصول میں تعاون کرتا ہے اور اس تعاون کے مہیا کرنے کے لیے

(۱) احیاء العلوم جلد ۱ ص ۸، ۹۔ (۲) ایضاً جلد ۱ ص ۴۰۔

اجتماعی ہیئت اختیار کرتا ہے"۔

"وہ اسی قوت فکر سے ان پیغاموں کو قبول کرتا ہے جو انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے ہیں اور ان پر عمل کرتا ہے اور اپنی آخرت کی بھلائی کے وسیلے اختیار کرتا ہے، وہ ان تمام معاملات میں ہر وقت غور وفکر سے کام لیتا رہتا ہے، پل بھر بھی اس سے غافل نہیں ہوتا اور اسی غور وفکر کے ذریعہ سے علوم پیدا ہوتے ہیں، وہ اس فکر کے ذریعہ ان ادراکات کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اسے حاصل نہیں رہتے، اس لیے وہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرتا ہے جو اس سے پہلے علم حاصل کر چکے ہوتے ہیں، یا جن لوگوں کو اس کی معرفت زیادہ حاصل رہتی ہے، یا ان انبیا کی تعلیمات میں ڈھونڈھتا ہے جو پیشتر گذر چکے ہیں اور ان سے ان کی تعلیمات کی تلقین حاصل کرتا ہے اور ان کے حاصل کرنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے"۔

"پھر اس کی فکر ونظر ایک ایک کر کے حقائق تک پہنچتی ہے اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے اس کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کی مشق مسلسل جاری رکھتا ہے، یہاں تک کہ اس حقیقت کے عوارض کے الحاق سے اسے ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے اس وقت اس حقیقت کو جو چیز پیش آتی ہے، اس کے متعلق اس کا ایک مخصوص علم بن جاتا ہے اور آیندہ نسل اس کے حاصل کرنے کی مشتاق ہوتی ہے اور لوگ اس کے جاننے والوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی سے فن تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم وتعلیم انسانی فطرت کے لیے طبعی ہے"۔(۱)

پھر ابن خلدون نے امام غزالی سے زیادہ واضح طریقہ سے علم وتعلیم کو منجملہ دنیاوی

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۰، ۴۷۱۔

پیشوں کے ایک پیشہ قرار دیا ہے اور اس نے اسے مختلف و قیع دلیلوں سے ثابت کیا ہے،(۱) اس لیے یہ سمجھنا کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین میں صرف مذہبی تعلیم داخل رہی ہے، صحیح نہیں ہے بلکہ علماے اسلام نے جملہ علوم کو عقلی و نقلی دو بڑی قسموں میں تقسیم کر کے قسم اول یعنی عقلی علوم کی تحصیل انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری قرار دی ہے اور نقلی علوم کو ربانی پیغام کی تحصیل، دین و مذہب کی واقفیت اور آخرت کی بھلائی کے لیے حاصل کرنا فرض ٹھہرایا ہے، جیسا کہ امام غزالی کا بیان اوپر گذر چکا اسی طرح ابن خلدون لکھتا ہے:

> ''جن علوم پر انسان غور کرتا ہے اور جن کی تحصیل و تعلیم شہروں میں عام طور پر کی جا سکتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں ایک انسان کے لیے طبعی ہے، جسے وہ اپنی قوت فکر سے حاصل کرتا ہے اور دوسری نقلی ہے جسے اس کے وضع کرنے والے سے حاصل کیا جاتا ہے''۔
>
> ''قسم اول علوم حکمیہ فلسفیہ ہیں، یہ وہ علوم ہیں جن سے انسان اپنے غور و فکر کی طبیعت کے ذریعہ واقف ہوتا ہے اور اپنے بشری ادراک کے ذریعہ ان کے مسائل اور براہین تک پہونچتا ہے، یہاں تک کہ اس کی نظر وسیع ہو جاتی ہے اور وہ اس حیثیت سے کہ وہ صاحب غور و فکر انسان ہے، اس کے صواب و خطا کی تمیز کرتا ہے''۔
>
> ''اور دوسرے وہ وضع کیے ہوئے نقلی علوم ہیں جو واضع شرعی کی خبر کی بنیاد پر قائم ہیں اور اس میں عقل کو دخل نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اس کے فروعی مسائل کو اس کے اصول سے عقل و قیاس کے ذریعہ سے ملانے کی ضرورت پڑتی ہے، کیوں کہ بعد میں پیش آنے والے جزئیات نقل کلی کے ماتحت اپنی وضع کے

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۱، ۴۷۲۔

وقت درج نہیں کیے جا سکتے۔اس لیے قیاسی صورت کے الحاق کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ قیاس بھی اصل میں حکم کے ثبوت کے ساتھ خبر ہی سے نکلتا ہے، اس لحاظ سے یہ قیاس بھی نقل قرار پائے گا اور ان تمام نقلی علوم کی شرعی بنیاد کتاب وسنت ہے جو ہمارے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشروع کیا گیا ہے''۔(۱)

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۶، ۴۷۷۔

(۲)

اسلامی نظام تعلیم کے تین دور

زمانہ کے اعتبار سے اسلامی نظام تعلیم کے تین دور قائم کیے جا سکتے ہیں:

پہلا دور: عہد رسالت سے دولت امویہ کے ابتدائی زمانہ تک۔

دوسرا دور: عہد اموی سے چوتھی صدی ہجری تک۔

تیسرا دور: پانچویں صدی سے آٹھویں صدی ہجری تک۔

ان تینوں دوروں کی امتیازی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں:

پہلا دور: قرآن مجید جس طرح اسلامی علوم وفنون کا سرچشمہ ہے، ویسے ہی مسلمانوں کے تعلیم وتعلم کی داستان کا آغاز بھی اسی کے نام سے ہوتا ہے، نزول قرآن کے ساتھ اس کی کتابت کی ضرورت پیش آئی اور رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ چند کاتبوں عبداللہ بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کو فن کتابت سکھانے کے لیے مقرر فرمایا اور بعض صحابہ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ وحضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں باشندگان مدینہ کو قرآن مجید پڑھانے کے لیے مدینہ بھیجے گئے (۱) پھر مدینہ منورہ پہونچ کر آپ نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر توجہ رکھی اور نوشت وخواند دونوں سلسلے قائم رہے، غزوۂ بدر کے قیدیوں میں سے جو لوگ لکھنا جانتے تھے ان کا فدیہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھانا قرار پایا (۲) اسی طرح مسجد نبوی

(۱) مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۹۱، و بخاری کتاب التفسیر آیۃ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى۔ (۲) ایضاً جلد اص ۲۴۶۔

میں اصحاب صفہ کا حلقۂ درس قائم کیا گیا، جس میں ایک شخص قرآن مجید پڑھتا تھا اور حلقہ کے دوسرے حاضرین اسے توجہ سے سنتے تھے پھر نئے مہاجرین جو دوسرے مقاموں سے آتے گئے وہ درس قرآن کے لیے اسی حلقہ میں شریک کیے گئے۔(۱)

اس حلقہ کے ماسوا ہر تعلیم یافتہ مسلمان ناخواندہ مسلمان کے لیے معلم تھا، عربوں کے جو وفد دور دور سے مدینہ منورہ آتے وہ انصار کے مکانوں میں فروکش ہوتے تھے، جہاں انہیں کتاب وسنت کی تعلیم دی جاتی تھی چنانچہ وفد عبدالقیس کا بیان ہے کہ:

> ''انصار ہمیں ہمارے پروردگار کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے تھے''۔(۲)

پھر فتوحات کے بعد جب نظام حکومت کی تشکیل ہوئی اور عمال مقرر ہو کر ولایتوں میں بھیجے جانے لگے تو آپ نے ان کا مقصدِ سفر یہ بیان فرمایا کہ:

> ''(یہ بھیجے جاتے ہیں) تاکہ لوگوں کو قرآن اور اسلامی شریعت کی تعلیم دیں''۔(۳)

اس کے بعد خلافت راشدہ کے زمانہ میں جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا تو قرآن کی تعلیم کے لیے مستقل معلمین عمال کے ساتھ بھیجے گئے، جیسے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بصرہ کے عامل بنائے گئے تو حضرت عمران بن حصینؓ قرآن مجید وشریعت اسلامی کی تعلیم کے لیے ان کے ساتھ کیے گئے، اسی طریقہ سے شام کی فتح کے بعد مختلف شہروں میں عمال کے علاوہ قرآن کی تعلیم دینے والوں کا تقرر ہوا، حضرت عبادہ بن صامتؓ نے معلم قرآن کی حیثیت سے حمص میں قیام فرمایا، حضرت معاذ بن جبلؓ فلسطین روانہ ہوئے اور حضرت ابودرداؓ نے دمشق میں اقامت اختیار فرمائی(۴) ان معلمین نے نومفتوح شہروں میں قرآن مجید

(۱) مسند ابن حنبل جلد۳ ص ۱۳۷۔ (۲) ایضاً ۳ ص ۴۳۲۔ (۳) استیعاب تذکرہ حضرت معاذ بن جبلؓ عامل یمن۔ (۴) اسد الغابہ ترجمہ حضرت عبادہ ابن صامتؓ۔

کی تعلیم کے لیے مکاتب قائم کیے اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہو گیا، لوگ جوق جوق علم کی تحصیل کے لیے ان کے درس میں شریک ہوتے، حضرت ابودرداؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ دمشق کی جامع مسجد میں درس کے لیے بیٹھتے تھے تو طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ گویا کسی بادشاہ کے استقبال کے لیے لوگ جمع ہوئے ہیں (۱) صحابہ جہاں بیٹھتے محفل کی شمع بن جاتے اور لوگ علم حاصل کرنے کے لیے پروانوں کی طرح ان پر گرتے، ابوادریس خولانی بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ حمص کی مسجد میں گئے تو ۳۲ صحابہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، وہ یکے بعد دیگرے اپنی روایتیں سناتے رہے اور لوگ ہمہ تن گوش بن کر سنتے رہے۔ (۲)

صحابہ کرام نے علم حدیث کی اشاعت کی خدمت مستقل طور پر انجام دی جو جس شہر میں قیام پذیر تھا اس نے وہاں کی مسجد میں روایت وسماع کے لیے حلقہ قائم کر لیا تھا، مثلاً حضرت جابر بن عبداللہؓ مسجد نبوی میں مستقل طور پر درس دیتے تھے (۳) حضرت ابودرداؓ دمشق کی مسجد میں بیٹھتے تھے (۴) حضرت حذیفہ بن اسحاقؓ کوفہ کی مسجد میں درس کا سلسلہ قائم کیے تھے۔ (۵)

کتاب وسنت کی تعلیم واشاعت کے ساتھ جب مختلف نئی صورتوں اور ضرورتوں میں کتاب وسنت پر قیاس کر کے مسائل مستنبط کرنے کی ضرورت پڑی تو ایسے اہل علم متعین کیے گئے جو اس خدمت کو اپنی دینی اور علمی بصیرت سے انجام دیں اور لوگوں کو مسائل کے استنباط کے طریقے بتائیں چنانچہ مختلف صحابہ اس خدمت پر مامور ہوئے اور ان کے ذریعہ علم فقہ کی اشاعت ہوئی، مثلاً حضرت عبدالرحمان بن قاسمؓ شام میں (۶) حضرت عبداللہ بن معقل (۷)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حضرت ابودرداؓ۔ (۲) مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۲۸۔ (۳) حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۷۸۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ۔ (۵) مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۳۸۶۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عبدالرحمان بن سری۔ (۷) اسد الغابہ ترجمہ عبداللہ بن معقل۔

اور حضرت عمران بن حصینؓ بصرہ میں (۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مداین میں (۲) اور حضرت حبان ابن جبلہؓ مصر میں (۳) اس خدمت پر مامور تھے۔

پہلے دور کے تعلیمی خصوصیات: یہ نظام دولت امویہ کے عہد کے ابتدائی دنوں تک جاری رہا، اس دور کے تعلیمی خصوصیات اجمالاً حسب ذیل تھے:

۱۔ علم، قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں منحصر تھا، ان کے ماسوا کسی دوسرے علم کی اشاعت نہیں کی گئی۔

۲۔ تعلیم کتابی نہ تھی، قولی اور سماعی تھی۔

۳۔ تعلیم کے لیے کوئی معاوضہ لینا یا دینا ممنوع تھا، معلمین کے لیے معیشت کے دوسرے ذریعے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایک مہاجر نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کو جن سے وہ قرآن پڑھتے تھے، ایک کمان ہدیہ میں بھیجی تو آنحضرت ﷺ نے اس کے لینے سے منع فرما دیا۔ (۴)

۴۔ استاذ، طالب علموں سے بڑی شفقت اور محبت کا سلوک کرتے تھے، جس کی بہ کثرت مثالیں ہیں۔

۵۔ مسجدیں، تعلیم گاہ کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔

۶۔ علم حدیث کے چرچے سے علم کی تحصیل کے لیے سفر کرنے کا رواج ہوا، خود صحابہ کرام بھی ایک ایک حدیث کے تحقیق کے لیے ایک دوسرے کے پاس ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے تھے، ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے کوئی بات بیان فرمائی تھی، اس موقع پر حضرت عقبہ بن عامرؓ اور حضرت سائب بن مخلدؓ حاضر تھے، حضرت سائبؓ کو اس حدیث کے متعلق کچھ شبہہ ہو گیا تو انہوں نے صرف اس شبہہ کو دور کرنے کے لیے مصر کا سفر کیا اور

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عمران۔ (۲) یعقوبی جلد ۲ ص ۱۷۳۔ (۳) تہذیب التہذیب ترجمہ حبان۔

(۴) ابوداؤد کتاب البیوع باب فی کسب العلم۔

وہاں پر پہنچ کر حضرت عقبہؓ سے اس حدیث کی بابت دریافت کیا۔(۱)

۷۔علمی سفر کے متعلق یہاں تک احتیاط برتی جاتی تھی کہ اسے خالص تحصیل علم کے لیے ہونا چاہیے تھا، اگر اس میں کوئی دنیاوی غرض وابستہ ہو جاتی، یا کسی شہر میں کوئی پہنچتا اور ضمنی طور پر کچھ علم حاصل کرنا چاہتا تو اسے مایوس ہونا پڑتا تھا، ایک مرتبہ ایک شخص حضرت ابودرداؓ کی خدمت میں مدینہ سے کسی حدیث کے متعلق دریافت کرنے کے لیے آیا، انہوں نے پہلے اس سے یہ اطمینان کرلیا کہ یہ کسی دنیاوی غرض جیسے تجارت وغیرہ کے لیے نہیں آیا ہے، اس کے بعد اس سے حدیث بیان کی۔(۲)

دوسرا دور: دوسرے دور کا آغاز دولت امویہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کے زمانہ سے ہوتا ہے، علم کی اشاعت میں ان کے عظیم الشان کارنامے ہیں، ان ہی نے سب سے پہلے حدیثوں کے منتشر سرمایہ کو یکجا کرنے کے لیے صوبہ کے والیوں اور شہروں کے عاملوں کے نام فرمان بھیجے کہ:

> ''احادیث نبویہ کی تلاش کر کے انہیں لکھ لو، کیوں کہ مجھے علم کے مٹنے اور علما کے فنا ہونے کا خوف ہے اور صرف رسول اللہ ﷺ کی حدیث قبول کی جائے''۔(۳)

چنانچہ اس فرمان کے بموجب احادیث کا قیمتی سرمایہ جمع ہو گیا، سعد بن ابراہیم سے روایت ہے کہ:

> ''ہم کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کے دفتر حدیثیں لکھ لیں اور انہوں نے ان کا ایک ایک مجموعہ اپنی حکومت کے تمام حدود میں روانہ فرمایا''۔(۴)

---

(۱) حسن المحاضرہ جلد اص ۸۶۔(۲) مختصر جامع بیان العلم ص ۳۸۔(۳) بخاری کتاب العلم جلد اص ۲۰ فتح الباری جلد اص ۱۷۴۔(۴) مختصر جامع بیان العلم ص ۳۸۔

حدیثوں کے جمع کرنے کا مقصد صرف فن حدیث کی تعلیم واشاعت تھا چنانچہ اسی فرمان میں آگے چل کر ہے:

''علما کو چاہیے کہ علم کی اشاعت عام طور پر کریں اور تعلیم کے لیے درس کے حلقوں میں بیٹھیں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جان لیں، کیوں کہ علم صرف اسی وقت ضائع ہوتا ہے، جب وہ راز بن جاتا ہے''۔

ایک دوسرے فرمان میں لکھا:

''اہل علم کو حکم دو کہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں کیوں کہ حدیثیں فنا ہو رہی ہیں''۔(۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے نظام تعلیم میں ایک دوسری تبدیلی یہ کی، کہ پڑھانے والوں اور بعض اوقات پڑھنے والوں کو معاش کی فکر سے آزاد کر کے ان کے لیے مستقل وظیفے جاری کرنے کی ابتدا کی چنانچہ انہوں نے والیوں کو لکھ بھیجا کہ:

''جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے کو فقہ کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا ہے، ان میں سے ہر ایک کو بیت المال سے سو سو دینار دو، تاکہ وہ لوگ موجودہ حالت میں اس سے مدد حاصل کریں''۔(۲)

اسی طرح اس عہد میں نادار طلبہ کے لیے بھی وظیفے جاری کیے گئے جس کا تذکرہ ابن عبدالبر نے کیا ہے۔(۳)

اس کے ماسوا اسی زمانہ سے شروع ہو کر دولت عباسہ کے ابتدائی زمانہ تک مختلف شرعی، ادبی اور عقلی علوم کی تدوین ہوئی اور غیر زبانوں کے علوم عربی میں منتقل کیے گئے جس سے تصنیف، تالیف اور ترجمہ کا وسیع سلسلہ قائم ہو گیا چنانچہ اس عہد تک علوم قرآن حدیث، فقہ، کلام، مغازی، سیر، تاریخ، ادب، نحو، شعر، طب، فلسفہ، منطق، ریاضیات اور ہندسہ

(۱) سیرۃ عمر بن عبدالعزیز (ابن جوزی)۔ (۲) ایضاً ص ۹۵۔ (۳) جامع بیان العلم ص ۸۸۔

وغیرہ کی تدوین ہو چکی تھی۔

دوسرے دور کے خصوصیات: ان حیثیتوں سے اس دور میں حسب ذیل تعلیمی خصوصیتوں کا اضافہ ہوا:

۱۔ علوم وفنون کا سرمایہ سینوں سے نکل کر سفینوں میں آیا۔

۲۔ تالیف، تصنیف اور ترجمہ کا سلسلہ قائم ہوا۔

۳۔ کتب خانہ کا قیام عمل میں آیا۔

۴۔ اساتذہ اور طلبہ کے وظائف مقرر کیے گئے۔

۵۔ مسجدوں میں تعلیم کے لیے درس کے مستقل حلقے قائم ہوئے۔

۶۔ تعلیم عموماً مسجدوں ہی میں دی جاتی تھی بلکہ اگر کسی نئی تعلیم گاہ کے قائم کرنے کی ضرورت ہوتی تو نئی مسجد ہی تعمیر کی جاتی تھی۔ (۱)

۷۔ بعض اسلامی ملکوں میں اہل علم کو اپنا تعلیمی شغل جاری رکھنے کے لیے جہاد کی خدمت سے بھی مستثنیٰ کیا گیا۔ (۲)

۸۔ طریقہ تعلیم اس دور میں بھی وہی رہا جو پہلے دور میں تھا، یعنی استاد زبانی تعلیم دیتا تھا لیکن اس طریقہ میں پچھلے دور سے اس دور میں یہ اضافہ ہوا کہ املا کا طریقہ جاری ہوا، استاذ جو کچھ درس دیتا شاگرد اسے لکھ لیتے یا استاذ خود لکھاتا جاتا اور طلبہ لکھتے جاتے۔

۹۔ کتابوں کے مصنفین بھی اپنی کتابوں کی قرأت کراتے تھے۔

۱۰۔ کتابوں کی قرأت وسماع کی سند واجازت کے رواج کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔ (۳)

تیسرا دور: اس کے بعد اسلامی نظام تعلیم کا تیسرا دور شروع ہوا، اس میں تعلیم گاہوں کے

---

(۱) معجم البلدان جلد ۵ ص ۳۷۵ ذکر صقلیہ۔ (۲) ایضاً ص ۳۷۶۔ (۳) یہ حصہ مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیۃ از ص ۱۹ تا ص ۲۸ و تاریخ صقلیہ جلد دوم باب علوم وفنون از ص ۱۸۸ تا ۱۹۵ سے مستفاد ہے۔

لیے مسجدوں سے علاحدہ کر کے عمارتیں بنانے کا رواج ہوا، اگرچہ مسجدوں میں بھی تعلیم کا سلسلہ قائم رہا، تاہم تعلیم گاہوں کی علاحدہ عمارتوں سے اسلام کے تعلیمی نظام کی نئی تشکیل ہوئی، مدرسوں کے لیے قواعد وضوابط بنائے گئے، طلبہ اور اساتذہ کے لیے اقامت گاہیں تیار ہوئیں، ملک کے چیدہ اہل علم اپنے عہدہ کے فرق وامتیاز کے ساتھ بیش قرار تنخواہوں پر معلمی کے منصب پر سرفراز کیے گئے اور طلبہ کے تعلیمی وظیفے پابندی سے جاری کیے گئے، ان کے لیے تعلیم کے سامان مہیا کیے گئے، ان کے قیام، طعام اور لباس کا انتظام کیا گیا۔

تیسرے دور کے خصوصیات: ان حیثیتوں سے اس دور کے حسب ذیل نمایاں خصوصیات قرار پاسکتے ہیں:

۱۔ مدرسوں اور اقامت گاہوں کی تعمیر سے استادوں اور لڑکوں کی باہمی معاشرت کا آغاز ہوا۔

۲۔ بڑے بڑے اوقاف کی بدولت علما، فراغ بالی سے اپنی خدمتیں انجام دیتے رہے اور لڑکوں کے لیے بھی تعلیمی سہولتیں بہم پہونچیں۔

۳۔ مدرسوں کی تعمیر اور اوقات کا قیام دینداری کی ایک علامت قرار پائی اور نیک دل مسلمانوں نے آخرت کی بھلائی کے لیے مدرسے اور دار الاقامے قائم کیے، نیز مدرسوں کی تعمیر اس دور کے تمدن میں دنیاوی اعزاز اور سر بلندی کا ذریعہ سمجھی گئی، جس کی وجہ سے امرا واہل مناصب نے مدرسوں کی تعمیر میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیا۔

۴۔ اسلامی ملکوں کی تعلیمی ترقی سے درس وتدریس کا پیشہ اس قدر معزز سمجھا جانے لگا کہ اہل علم وزرا وامرا اپنی غیر معمولی مشغولیتوں کے باوجود پڑھنے پڑھانے کے لیے بھی وقت نکالتے تھے چنانچہ اس زمانہ کے امرا کے سوانح میں ان کے اہل علم کے درس کے حلقہ میں بلاتکلف شریک ہونے اور خود درس کا حلقہ قائم کر کے لوگوں کو پڑھانے کے واقعات ملتے ہیں۔

۵۔مختلف علوم وفنون کے لیے جداگانہ مدرسے قائم کیے گئے۔

۶۔طریقہ تعلیم کے لحاظ سے اس دور میں بھی املا کا طریقہ جاری رہا اور مصنفین اپنی کتابیں پڑھاتے تھے لیکن اس دور میں کتابوں کی قرأت اور سماع کی سند اور اجازت کا طریقہ پہلے دور سے زیادہ اہتمام سے جاری ہوا، نیز اس دور میں ایک اضافہ یہ ہوا کہ نصاب تعلیم کی چیدہ کتابیں منتخب کی گئیں اور ہر فن میں جو معیاری کتابیں نکلیں، انہیں درس کے نصاب میں داخل کیا گیا، ہر فن کے پڑھانے کے لیے مختصر رسالے تیار کیے گئے لیکن پھر امتداد زمانہ سے نصاب درس میں غیر ضروری کتابیں بھی داخل ہوگئیں اور مختلف زمانوں میں نصاب کی اصلاح کی کوششیں جاری رہیں۔(۱)

عہد اسلامی کے مختلف دوروں میں اسلامی ملکوں میں تعلیم کے اہم مرکز: اسلامی نظام تعلیم کے ان مختلف دوروں میں اسلامی ممالک کے مختلف شہر تعلیم کے اہم مرکز بنے رہے، جہاں تعلیم کے سلسلہ کے تمام وسائل مہیا رہتے تھے اور طلبہ دور دور سے پہونچ کر وہاں علم کی تحصیل کرتے تھے، یہ تعلیمی مرکز مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں، ابن خلدون نے اس کی یہ صحیح توجیہ کی ہے کہ جس ملک کا تمدن جس قدر ترقی یافتہ رہا، اسی قدر وہاں اعلی تعلیم کے موقعے اور وسیلے پیدا ہوئے اور پھر جس ملک کو تمدنی حیثیت سے زوال آیا، وہ اپنے تعلیمی مرکز کے امتیاز کو بھی کھو بیٹھا چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> ”اس کا سبب یہ ہے جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں کہ علوم کی تعلیم بھی منجملہ پیشوں کے ایک پیشہ ہے اور ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں، کہ پیشے شہروں ہی میں زیادہ ہوتے ہیں اور شہروں کی تمدنی ترقی اور تنزل کے اعتبار سے ان میں بھی بیشی اور کمی ہوتی ہے، جس قدر تمدنی لطافتیں بڑھتی ہیں، ان پیشوں میں بھی باریکیاں اور ندرتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں، کیوں کہ یہ انسانی خاصہ ہے کہ جب معاشی فراغ

(۱)ان مباحث کی تفصیل آگے آئے گی۔

بات حاصل ہوتی ہے تو انسان کی زندگی میں مزید لطافت پیدا ہوتی ہے اور ان میں علوم وصنائع سے شغف پیدا ہوتا ہے''۔

اسی اصول کے بموجب اسلامی عہد میں جو شہر تمدنی حیثیت سے کمال کے درجہ پہونچے وہ تعلیم کے مرکز بھی قرار پائے چنانچہ صحابہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ کو قدرۃً مدینۃ العلم کا لقب حاصل تھا پھر کوفہ وبصرہ کو یہ امتیاز حاصل ہوا اس کے بعد بغداد اور نیشاپور مشرق میں اور قیروان اور قرطبہ مغرب میں علم کے شہر قرار پائے اور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ان ہی شہروں کو تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے:

''بغداد، قرطبہ، قیروان، بصرہ اور کوفہ کو دیکھو کہ جب یہاں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تمدن پھیلا اور عمرانی ترقی کمال کے درجہ پر پہونچ گئی تو یہاں علم کے سمندر جوش مارنے لگے اور یہاں کے باشندے تعلیمی اصطلاحات اور مسائل کے استنباط میں تفننِ طبع دکھانے لگے لیکن جب یہاں کے تمدن کو زوال آیا اور یہاں کے باشندوں میں ابتری پیدا ہوئی تو وہ بساط الٹ گئی اور علم اور تعلیم مفقود ہو کر یہاں سے دوسرے شہروں میں منتقل ہو گیا۔(۱)

اس کے بعد جن اسلامی شہروں کو سیاسی حیثیت سے بلندی حاصل ہوئی اور ان کی تمدنی ترقی کا دور آیا وہی شہر تعلیم کے مرکز بھی قرار پائے، لکھتا ہے:

''جب بغداد، بصرہ اور کوفہ جیسی علم کی کانیں مٹ گئیں تو ان سے بڑے بڑے شہر پیدا ہو گئے اور علم کا مرکز وہاں سے عراق عجم میں منتقل ہو کر خراسان وماوراء النہر میں قائم ہو گیا اور پھر قاہرہ میں منتقل ہوا اور چوں کہ قاہرہ کی تمدنی حیثیت مسلسل قائم رہی، اس لیے یہاں علم کا مرکز بھی ہر زمانہ میں موجود رہا، یہاں تک کہ جولڑکے علم حاصل کرنے کے لیے مغرب سے مشرق جاتے ہیں،

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۲۶۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اہل مشرق کی عقل وذہانت اہل مغرب سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ فطری طور پر ان سے زیادہ عقلمند اور تیز ہوتے ہیں''۔

اس طریقہ سے وہ مغرب اور مشرق کے باشندوں کی انسانی خصوصیتوں میں فرق سمجھنے لگے حالاں کہ یہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔

مشرق اور مغرب کی اقلیموں میں کوئی فرق نہیں ہے..... بلکہ اہل مشرق تمدن کی ترقیوں کی وجہ سے اور مسلسل مشق جاری رہنے سے اہل مغرب سے بڑھ گئے ہیں اور ان کی تمام عقلی ترقیوں کا حقیقی سبب صرف اسی قدر ہے۔(۱)

ایک دوسرے مقام پر اس نے اپنے زمانہ یعنی آٹھویں صدی کے تعلیمی مرکزوں پر نظر ڈالی ہے جس سے اس عہد میں مختلف ملکوں کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہوتا ہے، کہتا ہے:

''اس زمانہ میں مغرب کے تمدن میں اختلال اور یہاں کی حکومتوں میں ابتری پیدا ہونے کی وجہ سے یہاں سے تعلیمی اقتدار اور مرکزیت فنا ہونے والی ہے، قیروان اور قرطبہ مغرب اور اندلس میں سب سے متمدن شہر تھے، انہیں پوری تمدنی ترقی حاصل ہوئی اس لیے یہاں ہر قسم کے علوم اور پیشوں سے بازار گرم تھے اور ان کے سمندر جوش مار رہے تھے اور ایک زمانہ تک رہنے سے یہاں تعلیم لوگوں کی طبیعتوں میں راسخ ہوگئی تھی، جب یہ دونوں مرکز برباد ہوگئے تو مغرب سے تعلیم بھی رخصت ہوگئی صرف کسی قدر نام ونشان باقی رہ گیا چنانچہ مراکش میں دولت موحدیہ کے عہد میں یہاں کی پچھلی تعلیمی ترقیوں کے اثر سے کچھ نشانات پائے گئے لیکن حکومت کے ابتدائی زمانہ کے ہونے اور اس کے جلد ختم ہوجانے کی وجہ سے یہاں حضارت راسخ نہ ہوسکی تھی البتہ مشرق سے چند اہل علم علوم حاصل کرکے لوٹے اور ان کے ذریعہ سے تونس،

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۳۷۴۔

تلمسان اور بجایہ میں علم کی روشنی پہنچی لیکن مغرب کے دوسرے حصے جیسے فاس وغیرہ تعلیم کی خوبی سے اس وقت سے خالی ہو گئے جب سے قرطبہ اور قیراون کے تمدن کو زوال آیا اور ان باشندوں کی ذہنی ترقی کا موقع باقی نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب کے مدرسوں میں جو علوم ۱۶ سال میں لڑکوں کو ختم کرائے جاتے ہیں، وہ تونس میں صرف پانچ برس کی مدت میں پڑھا دیئے جاتے ہیں۔

اسی طرح اہل اندلس بھی رسم تعلیم سے بیگانہ ہو چکے ہیں، دو سو سالوں سے وہاں مسلمانوں میں جو تمدنی ابتری پھیلی ہے، اس کی وجہ سے علم کی طرف سے ان کی رغبت جاتی رہی ہے، اب ان میں صرف کسی قدر عربیت اور ادب کا ذوق پایا جاتا ہے، ورنہ فقہ کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور عقلی علوم تو بالکل مفقود ہو چکے ہیں کیوں کہ دشمن اندلس کے صرف تھوڑے سے ساحلی حصہ کو چھوڑ کر پورے ملک پر قابض ہو چکے ہیں اس لیے جو مسلمان وہاں موجود ہیں، ان کی توجہ زیادہ تر معاش کے حصول پر مبذول رہتی ہے جس کی وجہ سے انہیں کسی دوسری طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے''۔(۱)

پھر مشرق کے حال میں لکھتا ہے:

''مشرق میں اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ علم اور تعلیم کا مرکز قاہرہ بنا ہوا ہے، کیوں کہ اس کی تمدنی حیثیت ہزاروں سال سے قائم ہے، اس لیے یہاں کی طبیعتوں میں صنائع پورے طور سے راسخ ہو چکے ہیں اور ان ہی میں پیشۂ تعلیم بھی ہے، خصوصاً پچھلی دو صدیوں سے ترکوں کی دولت صلاحیہ ایوبیہ کے زمانہ میں تعلیمی حیثیت سے کمال کے درجہ پر پہونچ گیا ہے''۔(۲)

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۲۔۴۷۳۔ (۲) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۶۔

اسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی دہلی علم وتعلیم کے مرکز کی حیثیت سے روشناس تھا چنانچہ قلقشندی نے آٹھویں صدی کے ہندوستان کے ذکر میں دکھایا ہے کہ صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے۔(۱)

اس کے بعد دور حاضر سے کچھ پہلے تک عالم اسلامی میں تعلیم کے دو مرکز رہے، ایک مصر میں قاہرہ اور دوسرے ترکی میں قسطنطنیہ اور دولت عثمانیہ کو اولیت کا یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اسلامی نظام تعلیم کو جدید شاہراہ پر لائی اور نئی اصلاحیں رائج کر کے نئے طریقوں پر مدرسوں کا نظام قائم کیا اور یونیورسٹی کے طرز پر مدرسوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کیا۔

عہد اسلامی کے ان مختلف دوروں میں تعلیم کے جو اہم مرکز رہے، ان میں وہاں کے ممتاز اساتذہ کو اہمیت حاصل رہی، ان ہی کا تنہا وجود اس شہر میں خود مستقل یونیورسٹی تھا اور جس طرح اس زمانہ میں یونیورسٹیوں کی ڈگریاں وقعت رکھتی ہیں، اس زمانہ میں ان اساتذہ کی شاگردی کی سند وقعت رکھتی تھی، کسی کے لیے یہ فخر کا باعث نہ تھا کہ مثلاً وہ مدرسہ نظامیہ یا مستنصریہ کا سند یافتہ ہے بلکہ یہ باعث امتیاز تھا کہ فلاں شیخ سے اسے تلمذ کا شرف حاصل ہے اور جن شہروں میں ایسے مستند اساتذہ کا وجود قائم رہا، اس وقت تک ان شہروں کی تعلیمی مرکزیت برقرار رہی۔

ان میں سے ہر شہر میں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اہل کمال ہوتے تھے اور ان کے وجود سے علم وتعلیم کا سلسلہ قائم رہتا تھا، مسلم بن ابراہیم کہتے ہیں کہ:

"میں نے آٹھ سو شیوخ سے حدیث لکھی مگر مجھے (بغداد کے) پل کو (جو دجلہ پر تھا) عبور نہیں کرنا پڑا"۔(۲)

اسی طرح خلیفہ المقتدر باللہ نے ۳۱۹ھ میں ایک سلسلہ میں شہر کے طبیبوں کو شمار کرایا تو ان کی تعداد (۸۶۰) سے زیادہ نکلی جن میں وہ ماہرین فن شامل نہ تھے، جنہیں

---

(۱) صبح الاعشیٰ جلد ۵ ذکر بلاد الہند۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۳۶۱۔

شہرت عام حاصل تھی اور جن کی حذاقت اور کمال فن پر عام اتفاق تھا(۱) نضر بن شمیل بصرہ سے روانہ ہوئے تو تقریباً تین ہزار صرف اہل علم نے ان کی مشایعت کی۔(۲)

(۳)

نظام مدارس و دارالاقامہ

درس گاہ کی عمارتیں: اسلامی نظام تعلیم کے پہلے اور دوسرے دوروں میں تعلیم مسجدوں کے صحنوں، میناروں کے سایوں، خانقاہوں کے حجروں اور علما کے مکانوں میں جاری رہی اس زمانہ میں اگر تعلیم گاہ کے لیے عمارت کی ضرورت پڑی تو درس گاہ کی شکل کی عمارت کے بجائے نئی مسجد ہی تعمیر کی گئی، ابن حوقل سسلی کے حال میں لکھتا ہے:

> "ان دس مسجدوں میں جس کا میں نے تذکرہ کیا، ایک مسجد ابو محمد قفصی کی ہے جس میں وہ نماز پڑھتے ہیں اور اس کے پہلو میں بیس قدم پر ایک دوسری مسجد ہے جس کو انہوں نے اپنے لڑکے کی تعلیم گاہ کے طور پر تعمیر کرایا ہے"۔(۳)

چوتھی صدی کے اخیر میں درس گاہوں کے لیے مستقل عمارت بنانے کی ابتدا ہوئی اور اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ایک ہی صدی میں تمام اسلامی دنیا میں اس کا عام رواج ہو گیا اور مدرسوں پر بڑی بڑی جائدادیں وقف کی گئیں اور اسلامی تمدن نے ان کے لیے ہر قسم کے سامان مہیا کر دیے اور ان کے بناو قیام اور ان میں درس و تدریس کے لیے مفصل نظام عمل تیار ہو گیا۔

سب سے پہلا مدرسہ: اسلام میں سب سے پہلا مدرسہ کون سا تعمیر ہوا؟ اس کا جواب اسلامی مدارس کی تاریخ بیان کرنے والے کے ذمہ عائد ہوگا، ہم یہاں بر سبیل ذکر صرف علامہ سبکی کا ذیل کا بیان پیش کر دیتے ہیں جس سے کم سے کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ نظام الملک طوسی کا

(۱) عیون الاطبا جلد ۱ ص ۲۲۲۔ (۲) وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۱۶۱۔ (۳) معجم البلدان جلد ۵ ص ۳۷۵۔

مدرسہ نظامیہ بغداد جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے، پہلا مدرسہ نہیں ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں:

''یہ گمان کیا جاتا ہے کہ نظام الملک طوسی ہی نے سب سے پہلے مدرسوں کی بنیاد رکھی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ مدرسہ بیہقیہ نیشاپور نظام الملک کی پیدائش سے بھی پہلے قائم ہو چکا تھا، نیز مدرسہ سعیدیہ نیشاپور جسے سلطان محمود کے بھائی نصر بن سبکتگین نے اس زمانہ میں تعمیر کرایا تھا جب وہ وہاں کا والی تھا، تیسرا مدرسہ بھی نیشاپور ہی میں تھا، جسے واعظ وصوفی ابوسعید اسماعیل بن علی بن مثنیٰ استر آبادی نے بنایا تھا، چوتھا مدرسہ بھی یہیں تعمیر ہوا، جسے ابواسحاق اسفرائنی نے تعمیر کرایا، یہ صریح واقعہ ہے کہ یہ مدارس اس سے پہلے تعمیر پا چکے تھے، البتہ میرا گمان ہے کہ نظام الملک کو اس اولیت کا شرف ضرور حاصل ہے کہ اس نے طلبہ کے لیے وظیفے مقرر کیے کیوں کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا اس سے پہلے بھی مدرسوں میں طالب علموں کے لیے وظیفے ہوتے تھے یا نہیں''۔(۱)

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ''خیام'' میں اس کے تعلق سے نیشاپور کے مدرسوں پر بھی نظر ڈالی ہے، جن میں مذکورۂ بالا مدرسوں کا بھی ذکر آیا ہے لیکن موصوف نے سبکی ہی کے ایک دوسرے بیان سے نیشاپور کے پہلے مدرسہ کا بانی وہاں کے سامانی والی ناصر الدولہ ابوالحسن سیجوری متوفی ۳۷۸ھ کو قرار دیا ہے، جس نے امام ابوبکر محمد بن حسن بن فورک متوفی ۴۰۶ھ کے لیے اسے تعمیر کرایا تھا۔

اس کے بعد دوسرا مدرسہ بیہقیہ قرار پاتا ہے، جس میں امام الحرمین نے تعلیم پائی اور نظام الملک کی ولادت (۴۰۸۔۴۱۰) سے پہلے تعمیر ہوا، پھر تیسرا سعیدیہ ہے جس کا ذکرہ اوپر گذرا، چوتھا مدرسہ ابواسحاق ابراہیم اسفرائنی متوفی ۴۱۸ھ کے لیے بنا، پانچواں استر ابادی والا مدرسہ، چھٹا تغرل بیگ نے ۴۳۷ھ میں تعمیر کرایا اور ساتواں مدرسہ نظامیہ

---

(۱) طبقات الشافعیہ جلد ۳ ص ۱۳۷۔

نیشاپور ہے جسے نظام الملک نے اپنی وزارت کے زمانہ ۴۵۶ھ کے بعد امام الحرمین (۴۱۹۔ ۴۷۸ھ) کے لیے بنوایا تھا۔(۱)

ہندوستان کا پہلا اسلامی مدرسہ: ہندوستان میں مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت غالباً ناصر الدین قباچہ نے مولانا قطب الدین کاشانی کے لیے ملتان میں بنوائی اور اس میں حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی (مولود ۵۷۸ھ) نے تعلیم پائی۔(۲)

اسلامی نظام تعلیم کا مذہبی ہونا اور قیام مدارس کی شرط اول: اسلام کے تعلیمی نصب العین سے یہ آشکارا ہو چکا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کی ایک اہم خصوصیت اس کا مذہبی ہونا ہے، اس لیے مدرسوں کے قائم کرنے میں بھی اس کی یہ خصوصیت سب سے نمایاں رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ قوموں کے عروج اور ترقی میں ان کے مدرسے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، قومیں افراد سے بنتی ہیں اور افراد کی ان کے بچپن ہی سے ذہنی، اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت مدرسوں ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہے، اس لیے اگر مدرسے پاکیزہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی تعلیمات کی درس گاہ ہوں گے تو ان سے ایسی قوم تیار ہوگی جو زندگی کی صحیح شاہراہ پر چل کر اپنے وجود سے دنیا میں انسانوں کے مقصد تخلیق کو پورا کرے گی۔

اس لیے مسلمانوں نے مدرسوں کے قائم کرنے میں یہ اولین نقطہ سامنے رکھا کہ وہ افراد انسانیت کے لیے صحیح اور پاکیزہ اخلاق و روحانیت کی تربیت گاہ ہوں اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے بڑی بلند نظری سے خود ان مدرسوں کے لیے یہ شرط قرار دی کہ وہ پاکیزہ اخلاقی و روحانی مقاصد، حسن نیت اور اخلاص عمل کے ساتھ قائم کیے گئے ہوں اور ان کا سرمایہ معقول اور جائز ذرائع اور پاک روزی سے حاصل کیا ہوا ہو، ورنہ

(۱) خیام ص ۳ ۷ تا ۵ ۷ بحوالہ طبقات سبکی جلد ۳ ص ۵۲، ۱۳۷، ۲۵۲ تاریخ یمینی عتبی ص ۳۴۴، ابن خلکان جلد ۱ ص ۴ و ترجمہ ابن فورک و امام الحرمین و خطیب، و سفرنامہ ناصر خسرو، ص ۳۔ (۲) تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۴۰۸۔

اگر وہ کسی بری نیت اور دنیاوی غرض جاہ وعزت اور ناموری اور شہرت کے لیے قائم کیے گئے ہوں یا جور وظلم سے حاصل کی ہوئی دولت اس میں لگائی گئی ہو یا اگر کسی نے اس کی تعمیر کے وقت اپنے اثر واقتدار کو بے محل استعمال کر کے زمین اور تعمیر کے سامان غاصبانہ حاصل کیے ہوں، یا مزدوروں کی اجرت نہ ادا کی ہو تو ایسے مدرسوں کی عمارتوں میں پاکیزہ اخلاق اور روحانیت کا ماحول پیدا نہیں ہوسکتا ہے، اس لیے اس عمارت میں پڑھنے پڑھانے والے اور سکونت اختیار کرنے والے بھی محاسن اخلاق سے آراستہ نہ ہوسکیں گے اور صحیح اخلاقی اور روحانی خیالات سے محروم رہیں گے اور ان میں ایسی ذہنی استعداد مفقود ہوگی کہ وہ عملی دنیا میں اپنے دل ودماغ سے ایسی شاہراہ پر چلیں جو انسانیت کی تکمیل تک انہیں پہونچائے اور ان کے وجود سے انسانی تخلیق کا مقصد پورا ہو، اس لیے حقیقی تعلیم وتربیت صرف ان ہی مدرسوں میں حاصل ہوسکتی ہے جو حسن نیت اور اخلاص عمل کے ساتھ بلند مقاصد پیش نظر رکھ کر قائم کیے گئے ہوں چنانچہ قاضی ابن جماعہ علما وطلبہ کے لیے یہ اصول کار بیان کرتے ہیں کہ:

> ''حتی الامکان تعلیم کے لیے ایسے مدرسوں کو منتخب کرنا چاہیے، جن کے بانی زہد وتقوی سے قریب اور بدعتوں سے دور رہے ہوں اور یہ گمان غالب ہو کہ وہ مدرسہ اور اس کا وقف جائز پہلوؤں سے قائم کیا گیا ہے اور اس میں پاک روزی کی کمائی لگائی گئی ہے کیوں کہ جس طرح کھانے اور کپڑوں میں جائز اور ناجائز کی احتیاط ضروری ہے، اسی طرح قیام کی جگہ میں بھی اسے دیکھنا ضروری ہے''۔(۱)

یہی وجہ ہے کہ اسلامی دور میں جو مدرسے قائم کیے گئے، اس عہد کے علما اور طلبہ ان کے بانیوں کے ذاتی خصائل اور اخلاق اور مدرسہ کی تعمیر کی نوعیت کی تحقیق کرتے تھے اور

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۹۳ و ۱۹۶ و حاشیہ صفحہ مذکور۔

جو مدرسے بلند مقاصد کے ساتھ بہتر طریقے سے تعمیر پاتے، لڑکے ان میں جوق جوق تعلیم کے لیے داخل ہوتے تھے اور علما ان میں پڑھنے پڑھانے کو اخروی سعادت سمجھتے تھے اور جو مدرسے غلط بنیادوں پر قائم کیے جاتے، ان میں ایک تو متدین اہل علم درس وتدریس کے لیے تیار نہ ہوتے اور اس کے علاوہ وہ مدرسے طلبہ کے اژدحام سے بھی خالی نظر آتے تھے، مقریزی نے مصر کے بہت سے مدرسوں کا ذکر کیا ہے، اس نے اس سلسلہ میں اسی نقطہ نظر سے ان کے بانیوں کے صلاح وتقوی اور خصوصاً مدرسہ کی تعمیر جس نوعیت سے عمل میں آئی ہو، اس کا تذکرہ کیا ہے تاکہ ان کی زندگی کے مطالعہ سے ان کے قائم کیے ہوئے مدرسہ کی حیثیت آشکارا ہو اور طلبہ کو مدرسوں کے انتخاب میں آسانی حاصل ہو، مثلاً مدرسہ صاحبیہ بہائیہ کے ضمن میں لکھتا ہے:

> ''اس مدرسہ کو الوزیر الصاحب بہاء الدین علی بن محمد بن سلیم بن حنا نے ۶۵۴ھ میں تعمیر کرایا......... اس کی داد و دہش بہت ہے، وہ فقرا سے فراخ دلی سے حسن سلوک کرنے، نیکوں اور پرہیزگاروں کے ساتھ حسن عقیدت رکھنے اور ان کی اطاعت کرنے ان کی حالتوں اور ضرورتوں سے باخبر رہنے اور ان کے پورا کرنے اور ان کے حکموں کو جلد ماننے اور مشتبہ مالوں سے پرہیز کرنے اور بہ کثرت خفیہ اور علانیہ صدقات کرنے میں اپنی حد سے بڑھا ہوا تھا، یہاں تک کہ اس نے اپنی وزارت کے زمانہ میں کسی شخص سے کوئی ہدیہ قبول نہیں کیا، سوائے اس کے کہ کسی فقیر یا شیخ سے برکت حاصل کرنے کی نیت سے کچھ لے لیا ہو.....''۔

اس مدرسہ کے بانی کی اس دینداری اور تقوی کا یہ اثر تھا کہ مقریزی لکھتا ہے کہ ''یہ دنیا کے بڑے مدارس میں سے اور مصر کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، لڑکے اس میں داخل ہونے اور اس کے دار الاقامہ میں رہنے کے لیے دوسرے پر

سبقت کرتے ہیں"۔(۱)

اسی طرح مدرسہ قطبیہ کی بناء و تعمیر کے متعلق لکھتا ہے:

"یہ مدرسہ مونسہ خاتون...... متوفی ۶۷۳ھ کی طرف منسوب ہے، وہ محدثہ تھیں، حافظ ابوالعباس احمد بن ظاہری ان کے شاگردوں میں سے تھے، وہ عاقلہ دیندار...... اور بہت خیرات وصدقات کرنے والی تھیں، انہوں نے وفات کے وقت بہت بڑی دولت چھوڑی اور ایک مدرسہ کی تعمیر کی وصیت کی جس میں فقیہ اور قاری درس دیں اور نیز اس دولت سے جائداد خرید کر وقف کرنے کی وصیت کی چنانچہ اس مدرسہ کی تعمیر ہوئی اور اس میں مذہب شافعی وحنفی کے درس قائم کیے گئے اور تعلیم قرآن کے لیے قاری مقرر کیے گئے یہ مدرسہ آج تک معمور ہے"۔(۲)

اسی طرح امیر علاء الدین طیبرس متوفی ۷۱۹ھ نے جامع ازہر کے پہلو میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا جو مدرسہ طیبر سیہ کے نام موسوم ہوا، اس کی عمارت ایسی حسین اور نادر تیار کرائی تھی کہ مقریزی کے بقول اس عمارت کی تعمیری صنعتوں کی نقل اتارنی ممکن نہ تھی ۷۰۹ھ میں یہ عمارت مکمل ہوئی۔

اس مدرسہ کے بانی کے حسن نیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عمارت کی تکمیل کے بعد جب اس کے کثیر اخراجات کی فرد حساب اس کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے پانی سے بھرا ہوا ایک طشت منگایا اور حساب دیکھے بغیر حساب کے تمام کاغذات اس طشت میں یہ کہہ کر ڈال دیے کہ:

"جو چیز اللہ کے لیے نکال چکے ہم اس کا حساب نہیں کریں گے"۔(۳)

دوسری طرف جو مدرسے ظلم اور زیادتی کی بنیادوں پر قائم کیے گئے، مقریزی نے

---

(۱) خطط مصر مقریزی جلد۲ ص ۳۷۰، ۳۷۱۔ (۲) خطط مصر مقریزی جلد۲ ص ۳۶۸۔ (۳) ایضاً جلد۲ ص ۳۸۲۔

ان کے حالات کھول کر لکھے ہیں، جیسے قاہرہ کا ایک مدرسہ اقبغاویہ تھا جسے امیر علاء الدین اقبغا عبدالواحد نے تعمیر کرایا تھا، مقریزی اس مدرسہ کے متعلق لکھتا ہے:

''یہ مدرسہ ظلم کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں مساجد کی سی دینی رونق اور عبادت خانوں جیسی مذہبی عقیدت ومحبت لوگوں کے دلوں میں موجود نہیں ہے کیونکہ اقبغا عبدالواحد نے زمین غصب سے حاصل کرنے کے بعد اس پر یہ مدرسہ بنوایا ہے اس نے نائب السلطنت ایدمر اخلی کے وارثوں کو قرض دیا تھا اور انہیں اس وقت تک کے لیے چھوڑ دیا کہ وہ سب کچھ خرچ کرلیں اور ان کے پاس ادا کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے چنانچہ جب ان لوگوں کے پاس فوری طور پر قرض ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو اس نے اس کے ادا کرنے کا سختی سے مطالبہ کیا اور وہ لوگ اس کے شدید تقاضوں سے اسے اپنا مکان دینے پر مجبور ہوگئے، چنانچہ اس نے اسی مکان کو مسمار کرکے اس کی جگہ یہ مدرسہ تعمیر کرایا اور اسی طریقہ سے زمین کے چند اور قطعے لوگوں سے چھین کر اس میں ملا دیے بلکہ جامع مسجد کی فصیل کا ایک حصہ بھی اس میں شامل کردیا ہے۔

اس کے بعد اس نے شہر کے تمام معماروں، بڑھیوں، سنگ تراشوں اور مزدوروں کو جمع کیا اور یہ قرار دیا کہ ان میں سے ہر ایک شخص ہفتہ میں ایک ایک دن یہاں آکر بلا اجرت کام کیا کرے چنانچہ قاہرہ ومصر میں جتنے معمار اور کاریگر موجود تھے وہ ہفتہ میں ایک دن اس میں کام کرنے کے لیے آنے لگے اور اس امیر کے جو کارندے کاریگروں اور مزدوروں سے کام لیتے وہ بھی اپنے آقا کی طرح بڑے ظالم اور سنگ دل تھے اور معماروں اور مزدوروں کے ساتھ بڑی سختی کا برتاؤ کرتے تھے۔

پھر تعمیر کے لیے جس قدر پتھر، اینٹ، چونے، لکڑی، آلات تعمیر اور دوسرے سامانوں کی ضرورت ہوئی وہ سب بھی بغیر ایک حبہ قیمت ادا کیے ہوئے خواہ غصب کر کے حاصل کیے گئے یا سلطانی مال میں خیانت کر کے اس عمارت میں چیزیں لگائی گئیں کیوں کہ حکومت کی تعمیر کا صیغہ اسی کے ہاتھ میں تھا، پھر ان سب حرکتوں کے علاوہ جب تک اس مدرسہ کی تعمیر جاری رہی اور وہ جب کبھی اس کی تعمیر کے زمانہ میں اس کو دیکھنے آیا تو اس نے کاریگروں کو ہر مرتبہ بڑی بے دردی سے پیٹا"۔

جب یہ عمارت مکمل ہوگئی اور اس میں درس کا وقت آیا تو اس نے اس کی افتتاح کا جلسہ منعقد کیا، جس میں مصر کے فقہا، وقضاۃ بلائے گئے لیکن اسے کوئی ایسا متدین عالم دین نہ مل سکا جس کی تولیت میں اس مدرسہ کو دیتا البتہ جاہ پسند دنیا دار علما اس کی جانب متوجہ ہوئے اور اس کی تولیت کی خواہش ظاہر کی، ان ہی میں شریف شرف الدین علی بن شہاب الدین نقیب الاشراف ومحتسب قاہرہ بھی تھے، انہوں نے اس مدرسہ کی صدارت اور تولیت کے لیے امیر اقبغا سے گفتگو کی اور اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اس مدرسہ کے ہال کے لیے آٹھ ہزار درہم چاندی کی قیمت کا ایک قالین رشوت میں دیا جو افتتاح کے جلسہ کے دن ہال میں بچھایا گیا، لوگوں کا عام خیال تھا کہ امیر اقبغا اس موقع پر اس محتسب کے مدرسہ کے صدر مقرر ہونے کا اعلان کر دے گا لیکن جب مجمع اکٹھا ہوگیا تو امیر اقبغا نے خلاف توقع اعلان کر دیا کہ وہ اس زمانہ میں کسی شخص کو اس کی تولیت سپرد نہیں کرے گا اور لوگ مدرسہ کا افتتاح کیے بغیر منتشر ہوگئے۔(۱)

مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی مختلف قسمیں: اسلامی عہد میں مختلف قسم کے مدرسے اور تعلیم گاہیں تھیں:

---

(۱) خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۸۳، ۳۸۴

۱۔ مکاتب جن میں ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔

۲۔ مدارس عامہ، جن میں شرعی علوم، ادب اور عقلی علوم پڑھائے جاتے تھے۔

۳۔ مدارس قرآن، جو قرآن مجید کے درس کے لیے خاص تھے، جیسے سسلی او
واسط میں قائم تھے۔ (۱)

۴۔ دارالحدیث کے نام سے علم حدیث کی تعلیم کے لیے عمارتیں بنائی گئی تھی جن
میں صرف حدیث کی روایت وسماع وقرأت ہوتی تھی، جیسے نورالدین محمود بن زنگی نے دمشق
میں اور الکامل ناصر الدین نے قاہرہ میں بنوائے تھے، (۲) دمشق کا دارالحدیث صاحب الجواہ
المضیہ کے بقول روئے زمین کا سب سے پہلا دارالحدیث تھا۔ (۳)

۵۔ مدارسِ فقہ، فقہ حنفی اور شافعی کی تعلیم کے لیے علاحدہ علاحدہ مدرسے قائم کیے
جاتے تھے، دمشق، حلب اور مصر وغیرہ کے حالات میں ایسے بہت سے مدرسوں کا تذکر
خطط مقریزی اور حسن المحاضرہ سیوطی میں آیا ہے، نیز بعض مدرسوں میں فقہ حنفی وشافعی دونو
کی تعلیم کے لیے درس کے حلقے ہوتے تھے۔ (۴)

۶۔ مدارس طبیہ، علم طب کے لیے علاحدہ مدرسے قائم ہوئے، جیسے سلرنو اا
بغداد اور قاہرہ میں طبی مدرسے کھولے گئے، نیز طب کی تعلیم عام مدرسوں میں بھی دی جاتی
تھی اور ہسپتالوں میں عملی تجربے سکھائے جاتے تھے۔

۷۔ مستقل مدرسوں کے قائم ہوجانے کے باوجود اسلامی دنیا کی مسجدوں میں ع
کے درس کے حلقے قائم رہے جن میں کوئی فن تفسیر پڑھاتا، کوئی حدیث کی روایت کرتا اور کوئ
فقہ پر درس دیتا تھا، اسی طرح ادب، شعر اور عقلی علوم کے درس کے حلقے بھی قائم ہوتے تھے۔

۸۔ بعض اساتذہ ہفتہ میں ایک دفعہ اپنا حلقہ منعقد کرتے تھے، وہ دن ان کے درس

---

(۱) رحلہ ابن جبیر، ص ۳۳۲ رحلہ ابن بطوطہ جلد ا ص ۱۳۵۔ (۲) خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۷۵۔

(۳) الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۱۵۷۔ (۴) خطط جلد ۲ ص ۳۶۳، ۳۹۲، ۳۶۸، ۴۰۱ وغیرہ۔

اور خطبہ کے لیے مقرر ہوتا تھا جس میں بڑا اجتماع ہوتا تھا، خطیب شیخ ابوبکر سجاد کے متعلق لکھتا ہے:

"سچے تھے، علم رکھتے تھے، سنن میں ایک بڑی کتاب تصنیف کی، جامع منصور میں ان کا حلقہ جمعہ کے دن قائم ہوتا تھا، جمعہ کی نماز کے پہلے فتویٰ کے لیے اور نماز کے بعد املا اور خطبہ کے لیے"۔(۱)

حلقوں میں اکابر علمائے عصر کی شرکت و کثرت تلامذہ: ان حلقوں میں بلا امتیاز بڑے بڑے علما شریک ہوتے تھے اور اپنے معاصرین کے علم سے استفادہ کرتے تھے، ابن خلکان حضرت ربیعہ کے متعلق لکھتا ہے:

"پھر ربیعہ مسجد کو روانہ ہوئے اور اپنے حلقہ میں بیٹھے، مالک حسن ودیگر معززین شہر مدینہ اس حلقہ میں شریک ہوئے اور دوسرے لوگوں کا اس میں ازدحام ہوگیا"۔(۲)

ان حلقوں میں شاگردوں اور عام سننے والوں کی بڑی جماعت شریک ہوتی تھی، مثلاً ابوالحسن علی بن عاصم واسطی کے جو عراق کے امام وقت تھے، درس کے حلقہ میں تیس ہزار سے زیادہ مجمع ہوتا تھا(۳) اور یزید بن ہارون متوفی ۲۰۶ھ کی مجلس میں ۷۰ ہزار سے زیادہ آدمی امنڈ آتے تھے۔(۴)

علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں:

"علامہ ذہبی طبقات میں ابوالنقی متوفی ۲۵۱ھ کے ترجمہ کے بعد لکھتے ہیں کہ اس زمانہ کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تھے، اس بڑے مجمع میں دوسو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد و فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے"۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد۳ ص۸۰۔ (۲) وفیات الاعیان جلد۱ ص۲۲۹۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد۱ ص۲۹۱۔
(۴) ایضاً جلد۱ ص۲۹۲۔

خطیب مؤرخ بغداد علامہ ابوحامد اسفرائنی کے حلقہ میں خود شریک تھا، اس کا بیان ہے کہ سات سو طلبہ درس میں حاضر تھے، فراء نحوی نے کتاب المعانی کا جب لکچر دیا تو حاضرین میں ۸۰ صرف قاضی تھے، رضی الدین نیشاپوری کے حلقۂ درس میں چار سو فارغ التحصیل اہل علم حاضر تھے، بصرہ کی جامع مسجد میں امام بخاری نے جب مجلس املا منعقد کی تو ہزار کے قریب محدثین، فقہا، حفاظ، اہل مناظرہ شامل ہوئے، خود امام بخاری سے جن لوگوں نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی ان کی تعداد قریباً نوے ہزار ہے۔ (۱)

سلیمان بن حرب بصری قاضی مکہ بغداد آئے تو خلیفہ مامون نے ان کی حدیث کی مجلس کا اہتمام کیا، قصرِ خلافت کے پاس منبر کی طرح ایک اونچی جگہ بنائی گئی اور میدان میں حدیث سننے والے جمع ہوئے تخمینہ کیا گیا کہ اس میں چالیس ہزار اشخاص شریک ہوئے خود خلیفہ مامون بھی مجلس میں حاضر تھا اور شیخ کی حدیثیں اپنے قلم سے لکھتا جاتا تھا۔ (۲)

محدث عاصم بن علی جب بغداد آئے اور شہر کے باہر نخلستان میں درس حدیث کا حلقہ قائم کیا گیا، اس میں ایک خلقت امنڈ آئی، خلیفہ ہارون رشید بھی اس مجلس میں آیا، شیخ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھے تھے اور خلیفہ ایک خمدار کھجور کے تنہ پر بیٹھ کر حدیثیں لکھتا تھا، اس مجلس کا اندازہ کیا گیا تو ایک لاکھ بیس ہزار نفوس نکلے۔ (۳)

ابومسلم صاحب سنن بغداد آئے تو ان کے حلقہ میں سات مستملی اس طریقہ سے کھڑے کیے گئے کہ ایک اپنی آواز دوسرے تک پہنچائے، اس میدان کی پیمائش کی گئی اور دواتیں شمار کی گئیں تو ۴۰ ہزار سے زیادہ نکلیں اور جو لوگ کاغذ اور دوات کے بغیر صرف سننے کے لیے شریک ہوئے تھے وہ ان کے علاوہ تھے۔ (۴)

---

(۱) مقالات شبلی جلد ۳ ص ۸۰۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۶۰۔ (۳) ایضاً ص ۳۶۳، ۳۶۴۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۹۶۔

شیخ ابوبکر جعفر فریابی کی مجلس میں ۳۱۶ مستملی اور حاضرین ۳۰ ہزار کے قریب تھے۔(۱)

امام بخاری کے صرف ایک شاگرد سے ۹۰ ہزار طلبہ نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی تھی۔(۲)

اوقاف: جیسا کہ اوپر کہا گیا مدرسوں کی تعمیر کے ساتھ ان کے مصارف کے لیے بڑے بڑے اوقاف کیے گئے جن سے معلموں اور طالب علموں کے وظیفے جاری کیے جاتے اور مدرسوں کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی تھیں، نظام الملک طوسی کے اوقاف جو اس نے مدرسوں کے لیے اپنی جاگیروں کا دسواں حصہ کیا اور دو لاکھ دینار مدرسہ نظامیہ بغداد پر صرف کیے، وہ عام شہرت رکھتے ہیں، اس طرح مستنصر نے مدرسہ مستنصریہ کے لیے جو مواضع وقف کیے تھے ان کی آمدنی ستر ہزار مثقال سونا تھی جو آج کل کے حساب سے بقول مولانا شبلی مرحوم ساڑھے چار لاکھ سالانہ ہوتی ہے(۳) ابن جبیر بغداد کے مدرسوں کے حال میں لکھتا ہے:

> ''یہاں ۳۰ مدرسے ہیں اور یہ سب مشرقی جانب ہیں ان میں سے کوئی مدرسہ ایسا نہیں جو عظیم الشان قصر سے کم ہو، ان میں سب سے بڑا اور مشہور نظامیہ ہے، اسے نظام الملک نے قائم کیا تھا اور ۵۰۴ھ میں اس کی تجدید ہوئی، ان مدرسوں کے لیے بڑے اوقاف ہیں جن کی آمدنی سے یہاں کے استادوں اور طالب علموں کو وظیفے دیے جاتے ہیں''۔(۴)

اوقاف کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا بلکہ مشکل سے کوئی ایسا مدرسہ ہوگا جس کے اخراجات کے لیے کوئی آمدنی وقف نہ کی گئی ہو، ان کے ذریعہ امرا اور ارباب خیر خدا کی راہ میں اپنی دولت صرف کر کے اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ جمع کرتے تھے، خصوصاً

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۶۲۔ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۵۸۰۔ (۳) مقالات شبلی جلد ۳ ص ۴۷۔

(۴) رحلہ ابن جبیر ص ۲۲۹۔

پانچویں سے آٹھویں، نویں صدی تک اس کا بہت رواج تھا۔

ابن خلدون نے مصر میں اوقاف کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ دولت صلاحیہ کے زمانہ سے مصر کے امرا جو زیادہ تر غلاموں اور موالیوں میں سے تھے، حکومت کے روز روز کے انقلاب سے خائف تھے، اس لیے وہ بڑے بڑے اوقاف کر کے اپنے لڑکے کے حقوق ان سے متعلق کر دیتے تھے تا کہ حکومت کے انقلاب کا اثر جائداد کی ضبطی کی صورت میں ظاہر نہ ہو چنانچہ ان اوقاف کی مدد سے مصر میں بہت سے مدرسے، زاویے اور رباط تیار ہو گئے اور علما اور طلبہ کے معقول وظیفے جاری ہو گئے، اس کے ساتھ ابن خلدون نے تصریح کے ساتھ یہ بھی اقرار کیا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں میں جائدادیں وقف کر کے کار خیر انجام دینے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔(۱)

بعض وقف کرنے والے اپنے اوقاف کے ساتھ مختلف شرطیں لگا دیتے تھے، جیسے ان کے وقف سے صرف حنفی طلبہ کو وظیفے دیے جائیں، خاص طور پر مصر میں حنفیوں اور شافعیوں نے اپنے اپنے مذہبوں کے لیے بڑے بڑے وقف کیے تھے، مصر میں ان اوقاف کا یکجا انتظام تھا، پہلے شافعیوں اور حنفیوں دونوں کے اوقاف کا متولی شافعی قاضی القضاۃ ہوتا تھا، اس رسم میں ایک ہندوستانی عالم سراج ہندی نے جو مصر میں حنفیوں کے قاضی القضاۃ تھے، تبدیلی کرائی چنانچہ اس کے بعد شافعی مذہب کے اوقاف شافعی قاضی القضاۃ کی نگرانی میں اور حنفی مذہب کے اوقاف حنفی قاضی القضاۃ کی تولیت میں آ گئے۔(۲)

بعض وقف کرنے والے اپنے اوقاف کے لیے بعض دوسری شرط لگا دیتے تھے، جیسے مصر کے مدرسۂ خروبیہ کے بانی بدر الدین محمد بن محمد خروبی نے اس مدرسہ کے وقف میں یہ شرط لگائی تھی کہ اس سے کوئی وظیفہ بجز عرب کے کسی عجمی کو نہ دیا جائے۔(۳)

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۶۔ (۲) الدرر الکامنہ جلد ۳ ص ۱۵۵ ترجمہ سراج ہندی۔ (۳) خطط مصر جلد ۲ ص ۳۷۹۔

اسلامی حکومتیں واقف کے شرائط کی پابندی بڑی احتیاط کے ساتھ کرتی تھیں۔

بعض اوقاف صرف کارخیر کے نام سے کیے جاتے تھے، ان سے بھی علما کے وظیفے جاری کیے جاتے تھے کہ وہ شہروں اور دیہاتوں میں رہ کر شرعی علوم کی اشاعت کی خدمت فراغ بالی سے انجام دیں۔

اسی طرح ''زوایا'' خانات'' رباط'' اور'' خوانک'' وغیرہ کے ناموں سے عمارتیں بنا کر ان پر وقف کیے جاتے تھے اور ان میں مذہبی جماعتیں مقیم رہ کر علم دین کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں، مقریزی نے ایسی بہت سی عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

دارالاقامہ: جس زمانہ تک مدرسوں کے لیے مستقل عمارتیں تعمیر نہیں ہوئی تھیں، نادار کے ان ہی مسجدوں کے حجروں اور استادوں کے مکانوں میں رہتے تھے، جب درس گاہ کے لیے عمارتیں تیار ہوئیں تو ان کے پہلو بہ پہلو دوسری عمارتیں بنائی گئیں جن میں طلبہ ٹھہرائے گئے ، نیز بعض اوقات ''خوانیت'' زوایا'' رباط'' خانات'' بیوت'' اور'' رواق'' وغیرہ سے موسوم عمارتیں بھی طالب علموں کے قیام گاہ کے کام آتی تھیں اور بعض جگہ تعلیم گاہ کی عمارت اس طرز سے بنائی جاتی تھی کہ اس میں طالب علموں کے قیام کے لیے بھی جگہیں نکل سکیں۔

ان اقامت گاہوں میں طالب علموں کے کھانے پینے، پہننے اور زندگی اور تعلیم کی دوسری ضرورتوں کی کفالت کی جاتی تھی، مدرسہ مستنصریہ بغداد کے دارالاقامہ کے حالات میں مولانا شبلی مرحوم یہ بیان فرما چکے ہیں کہ:

> ''مدرسہ ہی کے احاطہ میں ایک ہسپتال اور مزبلہ بھی تھا (جس سے گرمیوں میں پانی ٹھنڈا کرتے تھے) دوسو اڑتالیس مستعد طلبہ مدرسہ کھلنے کے ساتھ بورڈنگ میں داخل ہوئے جن کو مکان، فرش، خوراک، روغن، کاغذ، قلم وغیرہ مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا، ان کے دسترخوان پر معمولی کھانے کے علاوہ شیرنی اور میوے بھی چنے جاتے تھے، ان سب کے علاوہ ایک اشرفی ماہوار الگ

وظیفہ کے طور پر مقرر تھی"۔(۱)

ابن بطوطہ نے واسط کے ایک مدرسہ کا حال لکھا ہے، جسے ایک عالم دین شیخ تقی الدین نے اپنی ذاتی مصارف سے قائم کیا تھا اور اس میں وہ اور ان کے بھائی اور ان کے شاگرد علما، درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، وہ لکھتا ہے:

"یہاں (واسط میں) ایک پر رونق عظیم الشان مدرسہ ہے، جس میں تقریباً تین سو حجرے ہیں جن میں پردیسی لڑکے قرآن مجید کی تعلیم کے لیے آ کر ٹھہرتے ہیں..........اور انہیں روزانہ کے اخراجات خورد و نوش اور سالانہ پوشاک دی جاتی ہے"۔(۲)

اسی طرح ابن بطوطہ نے ایک دوسرے شہر تستر کے عالم دین شیخ شرف الدین موسیٰ بن صدر الدین سلیمان کے اوصاف بیان کر کے ان کے ایک مدرسہ کا حال یہ لکھا ہے:

"اور ان کا ایک مدرسہ اور زاویہ ہے جس میں چار نوجوان خدام سنبل، کافور، جوہر اور مسرور انتظام کے لیے مقرر ہیں، ان میں سے ایک زاویہ کے اوقاف کا نگہبان ہے، دوسرا روزانہ کے اخراجات کو دیکھتا ہے، تیسرا یہاں کے آنے والوں کی مہمان نوازی کی خدمت انجام دیتا ہے اور چوتھا باورچیوں، بہشتیوں اور جاروب کشوں کے کاموں کی نگرانی کرتا ہے"۔

"میں یہاں سولہ دن تک مقیم رہا اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں کے روزانہ کے کھانے نہایت نفیس اور قیمتی ہوتے ہیں، روزانہ چار قسم کے کھانے دستر خوان پر رکھے جاتے ہیں، مرغ، روٹی، پلاؤ اور قورمہ اور پھر مٹھائی کی تشتری علاحدہ چنی جاتی ہے"۔(۳)

ہندوستان کے اسلامی مدرسوں میں دار الاقامے: ہندوستان کے اسلامی مدرسوں

---

(۱) مقالات شبلی جلد ۳ ص ۹۶۔ (۲) رحلہ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۳۵۔ (۳) ایضاً جلد ۱ ص ۱۴۱۔

میں بھی دارالاقامے قائم تھے جن میں طالب علموں کے قیام وطعام کا معقول انتظام تھا۔

ابن بطوطہ ۷۳۴ھ میں ہندوستان آیا تھا، وہ سندھ کے مقام سیوستان میں ایک بڑے مدرسہ میں اترنے کا تذکرہ کرتا ہے، یہ گرمیوں کا زمانہ تھا، ابن بطوطہ رات کے وقت اس مدرسہ کی چھت پر سوتا تھا۔(۱)

دلی کے مدرسہ فیروز شاہی کے متعلق ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:

"وہرروز پیش ہر طایفہ وظیفہ مائدہ نعمت می کشند وچہ بحعبد ان ومتعلمان وحافظان ومصلیان وذاکران ومشغولان وچہ سایر بندگان خدا مدرسہ فیرز شاہی را اختیار کردہ وراحت ہا واسایش ہای گیرند"(۲)

فیروز شاہ کے عہد کے ایک شاعر مطہر کڑوی نے جو صاحب درس بھی تھا، ایک قصیدہ میں اس مدرسہ کے مفصل حالات قلم بند کیے ہیں، اس کے دارالاقامہ کے دسترخوان کے الوان نعمت کا ذکر یوں کرتا ہے:

ہمہ دراج وکبوتر بچہ وکبک وکلنگ	ماہئی ومرغ مسمن برۂ کوہ وقار
ناردان نوشکر ولوز وحوانج (فوانج) دردی	زعفران صندل ومشک (و) ہمہ بر (گونہ) افزار
قرص بریان زلیبا ودگر آرایش (کذا)	خشت (و) لوزینہ تر وخشک بہر سو انبار
راست گوئی کہ بیار است بہارے زنعیم	صحنہا برگ صفت کاسہ در ونرگس دار
واندران (وآبداران) ہمہ بردست قدحہا جلہ	کردہ باشربت حماض شراب انار
چون بپرداخت زمان محفل ازشرب ونوش	سفرہ برداشتہ شد دست کشیدند اخیار
برگ داران شدہ در دادن تنبول ودان	برگ دان ہائی زر وسیم گرفتہ یک بار
بیرہا (بیڑہ) چوں گل صد برگ چو.....گل	دوختہ آن گل صد برگ بیک سورت (سوزن خار)
زعفران انگ (رنگ) ولعد (کذا) مزہ وعنبر بوی	حرب پہلو تر اندام وتعط (۳) (کذا) رخسار (۴)

(۱) رحلہ ابن بطوطہ جلد ۲ ص ۷۔ (۲) تاریخ فیروز شاہی ص ۵۶۴۔ (۳) کذا، صحیح لفظ منقط ہے، دیکھو شمس سراج عفیف ص ۵۷ سطر آخر۔ (۴) رسالہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۵ ص ۱۳۸۔

عادل شاہ نے شاہی مدرسہ کے لڑکوں کے دارالاقامہ کا اہتمام کیا تھا اور انہیں روزانہ کھانا دیا جاتا تھا، پڑھنے کے لیے کتابیں مہیا کی جاتی تھیں اور نقد وظیفہ جاری تھا، بساتین السلاطین میں ہے:

''شاگردان را از سفرہ آتا و آش نان بوقت صبح بریانی دمزعفر و بوقت شام گندم وکھچڑی فی اسم یک ہون بدون این کتاب ہائے عربی وفارسی امداد نمایند''۔(۱)

وظیفے ہندوستان کے مدرسوں میں: جس طرح دوسرے اسلامی ملکوں میں طالب علموں کو وظیفے دیے جاتے تھے، ویسے ہی ہندوستان کے مدرسوں میں بھی وظیفے جاری تھے، جیسے فیروز شاہ کے متعلق ہے:

''وطوائفی کہ از طالبان علم محتاج دہ تنکہ بودند صدگان ودوبستگان وسیصدگان تنکہ ادرار معین گشت وعلماء ومتعلمان شہر از خرد و بزرگ با نعمت وثروت شدند''۔(۲)

مطہر کڑوی لکھتا ہے:

ہر جا کہ اہل دانش واصحاب وزہد بود — ناں دادودیر داد درمہا نثار کرد

پیران کہنہ سال ویتیمان خورد را — چنداں وظیفہ داد کہ صاحب یسار کرد(۳)

اسی طرح ہندوستان میں مختلف فرماں روا خاندانوں کے سلاطین نے اپنے اپنے زمانہ میں وظیفے مقرر کیے، عالم گیر نے ہر صوبہ میں یہ احکام جاری کردیے تھے کہ ہر صوبہ کے طالب علموں اور استادوں کے وظیفے اور تنخواہیں اسی صوبہ سے ادا کی جائیں اور استادوں سے سیاہہ کی مہریں لے کر اس صوبہ کے خزانچی کے پاس جمع کردی جائیں۔(۴)

اساتذہ کا قیام دارالاقامہ اوران کے قیام کے آداب: ان عمارتوں میں اساتذہ بھی قیام کرتے تھے اور طلبہ کی راحت رسانی اور تعلیمی ضرورتوں کی نگرانی کرتے اوران کی

(۱) بساتین السلاطین ص ۳۵۱۔ (۲) تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۹۔ (۳) اورینٹل کالج میگزین ۱۹۳۵ء مئی ص ۱۳۱، ۱۳۲۔ (۴) سیر المتاخرین جلد ۱ ص ۱۴۰ و مرأت احمدی جلد ۱ ص ۲۷۲۔

اخلاقی اور دینی تعلیم وتربیت پروقت صرف کرتے تھے، نیز اپنے بہترین اسوۂ عمل سے لڑکوں کے لیے نمونہ بنتے تھے اور بعض اوقات مدرسوں، زاویوں اور مسجدوں کی عمارتوں اور ان کے وقف اور وظیفوں کی نگہبانی کرتے تھے۔

اساتذہ وعلما عموماً دارالاقامہ کی نیچے کی منزل میں رہتے تھے اور لڑکے اوپر کی منزلوں میں رکھے جاتے تھے کیوں کہ اولاً علما کوان کی سن رسیدگی کی وجہ سے اوپر چڑھنے اترنے میں زحمت ہوتی، اس کے علاوہ ان کا تعلق رشد وہدایت اور فتوؤں کی وجہ سے شہر کے عوام سے بھی رہتا تھا، اس لیے مسئلے مسائل پوچھنے کے لیے نیچے کی منزل میں بآسانی پہنچ سکتے تھے۔

مدرسہ اور دارالاقامہ میں جو اساتذہ قیام کرتے تھے، وہ لڑکوں کی نگاہوں میں اپنا وقار قائم رکھتے تھے اور ایسی زندگی رکھتے کہ ایک طرف لڑکوں کے دلوں میں ان کا احترام قائم رہے، دوسری طرف ان سے لڑکوں کو علمی اور تعلیمی فائدے پہنچتے رہیں، مثلاً:

۱۔ وہ بلاضرورت اپنی اقامت گاہ سے باہر نہ نکلتے کیوں کہ باربار سامنے آنے اور چلتے پھرتے دکھائی دینے سے لوگوں کی نگاہوں میں احترام قائم نہیں رہتا ہے۔

۲۔ نماز التزام کے ساتھ باجماعت مسجد میں پڑھتے تھے تاکہ لڑکوں کے دلوں میں ان کی مذہبی پابندی میں سستی کرنے کا خیال نہ آئے اور لڑکے بھی پیروی کر کے نماز باجماعت کے پابند رہیں۔

۳۔ شرعی احکام اور جزئی مباح اور مستحب کے مسئلوں پر پابندی سے عمل کرتے تھے اور اخلاق ومعاشرت کے عام اصولوں کے پابند رہتے تھے۔

۴۔ اساتذہ لڑکوں کے لیے درس کے وقتوں کے علاوہ کوئی علاحدہ وقت بھی مقرر کر دیتے تھے، جس میں وہ لوگ ان کے پاس آکر اپنے علمی اور تعلیمی شکوک دور کرتے تھے، مطالعہ کی کتابوں کے مشکل مقاموں میں ان سے اشارے لیتے تھے اور کتابوں کے نسخوں کی تصحیح مشکل الفاظ واسماء کے حروف کے ضبط، ثقیل لغتوں کی تشریح اور کتابوں کے نسخوں کے

اختلاف کی تحقیق میں ان سے مدد لیتے تھے بلکہ بعض خاص صورتوں میں رات کے خالی وقتوں میں بھی شوقین لڑکوں کو پڑھاتے تھے، قاضی اسد بن فرات امام محمد کے حلقۂ درس میں شریک تھے، ان کی استدعا پر امام محمد نے انہیں بڑی شفقت سے رات کے وقت پڑھانا منظور کیا تھا، قاضی اسد خود کہتے ہیں کہ:

> ''میں نے محمد بن حسن سے کہا کہ میں پردیسی ہوں اور آپ سے فقہ وحدیث کا بہت کم سرمایہ جمع کر سکا ہوں کیوں کہ آپ کے شاگردوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے میرے لیے کیا خاص رعایت ہو سکتی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ عراقی لڑکوں کے ساتھ دن کے وقت درس میں شریک رہو اور رات کا وقت صرف تمہارے لیے خاص کرتا ہوں، رات کو میرے ہی پاس رہو میں تمہیں حدیثیں سنایا کروں گا''۔
>
> ''چنانچہ میں شب کو امام محمد کے یہاں رہنے لگا، وہ خود کوٹھے پر رہتے تھے اور میں نیچے کی منزل میں رہتا تھا لیکن میری خاطر سے وہ نیچے ہی اتر آئے اور درس کے لیے اپنے سامنے ایک پیالہ میں پانی رکھ کر بیٹھ جاتے، جب پڑھتے پڑھتے رات زیادہ گذر جاتی تو مجھے نیند آنے لگتی وہ مجھے اونگھتے ہوئے دیکھ کر ایک چلو پانی میرے منہ پر چھڑکتے اور میں بیدار ہو جاتا، ان کا اور میرا یہی طریقہ بدستور جاری رہا، یہاں تک کہ میں جس قدر ان سے پڑھنا چاہتا تھا پڑھ لیا''۔(۱)

دارالاقامہ میں طلبہ کی کثرت: کبھی کبھی دارالاقاموں میں لڑکوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو جاتی تھی کہ مجبوراً ایک کمرے میں دو دو اور تین تین لڑکوں کو ٹھہرانا پڑتا تھا آٹھویں صدی میں جامع ازہر مصر کے دارالاقامہ میں ۷۵۰ لڑکے رہتے تھے۔(۲)

---

(۱) خطط مصر جلد ۲ ص ۳۷۱۔ (۲) ایضاً۔

دارالاقامہ کے چند قواعد: قاضی ابن جماعہ نے طلبہ کو جو آداب سکھائے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دارالاقامہ میں طلبہ کے لیے کس قسم کے آئین و آداب رائج تھے۔

مثلاً چند آداب یہ ہیں:

۱۔ کمسن بچے کسی ولی کے بغیر دارالاقامہ میں نہ رکھے جاتے تھے۔

۲۔ لڑکوں پر دارالاقامہ سے باہر جانے میں پابندیاں عائد تھیں، خصوصاً مشتبہ مقاموں میں جانے کی اجازت نہ تھی، معلموں کے لیے بھی ایسے مقاموں سے گذارنا احتراز کے قابل سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ اور نہ دارالاقامہ میں ایسے شہریوں کے آنے دینے کی اجازت تھی جو تہذیب اور اخلاق میں لوگوں کی نگاہ سے گرے ہوتے تھے۔

۴۔ استادوں، لڑکوں اور ملازموں کے علاوہ کسی ایسے شخص کو مدرسہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی، جس کا مدرسہ سے کوئی تعلق نہ ہو۔

۵۔ شریعت کے احکام کی پابندی سختی سے کرائی جاتی تھی۔

۶۔ لڑکوں کے باہمی ملنے جلنے کے آداب اور استادوں سے ملنے جلنے میں ادب اور احترام کے آئین کی پابندی کرائی جاتی تھی۔

دارالاقامہ کے طلبہ کو چند آداب وتہذیب کی تلقین: قاضی ابن جماعہ نے دارالاقامہ میں رہنے والے لڑکوں کو چند تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور اجتماعی آداب اور تہذیب کی تلقین کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لڑکے بورڈنگوں میں کس طور وطریق سے رہتے سہتے تھے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

۱۔ مدرسے اور ان کے اوقاف نہ صرف سکونت اور عیش وآرام کے لیے قائم کیے گئے ہیں اور نہ خانقاہوں کی طرح محض نماز روزہ کی عبادتوں کے لیے ہیں بلکہ وہ اس لیے ہیں کہ علم کی تحصیل میں مدد پہنچائیں، لڑکوں کی زندگی کے یہ دن جو مدرسوں اور دارالاقاموں

میں بسر ہوتے ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں، انہیں ایک لمحہ کے لیے ضائع نہ کرنا چاہیے اور ان کو ان کے حقیقی اور صحیح مشغلوں میں صرف کرنے پر سب سے زیادہ نگاہ رکھنی چاہیے۔

۲۔ ہر طالب علم کا فرض ہے کہ وہ مدرسہ اور دارالاقامہ میں علم اور تعلیم میں لگے رہنے والوں سے ربط وضبط رکھے اور ان سے مفید علمی خدمات کا ذخیرہ بڑھاتا رہے۔

۳۔ دارالاقامہ میں تفریح، دلچسپی اور خوش گپی کی جو صحبتیں قائم ہو جاتی ہیں، ان سے علاحدہ رہ کر تحصیل علم میں مصروف رہے۔

۴۔ مدرسہ کے سبقوں اور مذاکروں کی مجلسوں میں پابندی سے شریک رہنا چاہیے اگر دارالاقامہ میں رہنے والے لڑکے ہی درس اور مذاکرہ کی مجلسوں سے غیر حاضر رہیں گے تو مدرسہ اور دارالاقامہ کے قائم کرنے کا اصل مقصود فوت ہو جائے گا۔

۵۔ مجلسوں اور حلقوں کے معلوم اور متعین وقتوں میں اپنی قیام گاہ کو نہ چھوڑنا چاہیے اور نہ مجلسوں سے اٹھ کر بار بار اپنے کمرے میں آنا چاہیے اور نہ ان وقتوں میں باہر کے کسی شخص کو اپنے یہاں مدعو کرنا چاہیے۔

۶۔ رفتار، گفتار، نشست برخاست اور گفتگو میں آداب وتہذیب ملحوظ رکھے جائیں، چال میں میانہ روی رکھنی چاہیے، پڑھنے اور تکرار کرنے اور بحث اور مباحثہ کرنے میں آواز پست رکھی جائے اور دروازہ کھولنے اور بند کرنے میں یہ احتیاط رکھی جائے کہ زور کی آواز پیدا ہونے پائے، یہ تمام باتیں تہذیب کے خلاف ہیں۔

۷۔ درس کے وقتوں میں کسی مدرس کے حلقہ کے سامنے سے گذرنا نہ چاہیے تا کہ درس وتدریس میں خلل اندازی نہ ہو۔

۸۔ دارالاقامہ کے دوسرے لڑکوں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کرنا چاہیے، ان کی ہمسایگی، ہم جنسی، ہم صحبتی، دینی برادری اور ہم پیشگی کا لحاظ کر کے ان سے مناسب سلوک کرنا چاہیے، ان کی برائیوں سے بچنا، ان کی لغزشوں کو معاف کرنا، ان کے عیوب کو چھپانا

ان کے ناروا سلوک سے چشم پوشی کرنا اور ان میں سے احسان کرنے والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

۹۔ اگر مدرسہ یا دارالاقامہ میں کسی کی بدخلقی اور بدطینتی کی وجہ سے رنج پہنچے تو تھوڑی دیر کے لیے اس جگہ سے علاحدہ ہو کر طبیعت میں سکون پیدا کرنا چاہیے اور اگر پھر تعلقات میں ہمواری پیدا ہو کر حالات سدھر جائیں تو اس مدرسہ سے منتقل نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ مدرسہ کو بار بار بدلنا خصوصاً مبتدیوں کے حق میں اچھا نہیں ہوتا ہے۔

۱۰۔ جب مدرسہ کے حجرے میں کسی جگہ سے گذرنا پڑے تو یہ احتیاط رکھنی چاہیے کہ جوتوں میں سے کوئی چیز چھوٹ کر فرش یا چٹائی پر گرنے نہ پائے اور نہ جوتے اس طرح ہاتھ میں اٹھائے جائیں کہ دونوں جوتوں کے تلے باہم مل جائیں بلکہ دونوں جوتوں کے اوپر کے رخ کو ایک دوسرے سے ملا کر رکھنا چاہیے اور جوتے کسی علاحدہ مقام پر رکھے جائیں لیکن مسجد کی چٹائی کے نیچے اس طریقہ سے نہ رکھے جائیں کہ چٹائی کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو۔

۱۱۔ اوپر کی منزل میں رہنے والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ آہستہ آہستہ چلیں کہ تیز چلنے کی وجہ سے نیچے کی منزل والوں کو تکلیف نہ پہنچے۔

۱۲۔ زینہ سے اترنے میں اگر دو آدمی ساتھ ہو جائیں تو ان میں سے چھوٹے کا فرض ہے کہ وہ جلد جلد اتر کر راستہ صاف کر دے اور جو اوپر رہ گیا ہو اس کی تہذیب کا تقاضا ہوگا کہ وہ اپنی جگہ اسی سیڑھی پر کھڑا رہے، جب پہلا اترنے والا نیچے اتر جائے تو وہ اترنا شروع کرے۔

اور اگر نیچے کی سیڑھی پر اوپر جانے کے لیے دو آدمی اکٹھے ہو جائیں تو چھوٹے کو چاہیے کہ وہ زینہ سے نیچے اتر آئے اور جب اس سے بڑی عمر کا چڑھنے والا اوپر چڑھ جائے پھر وہ اوپر چڑھے۔

۱۳۔ مدرسہ کے دروازہ یا دہلیز پر بیٹھنا نہ چاہیے اور نہ کسی راستہ کو گھیر کر کھڑا ہونا چاہیے تاکہ آنے جانے والوں کو زحمت پیش آئے۔

۱۴۔ مدرسہ کے صحن میں بلا ضرورت صرف تفریح یا ورزش یا کسی کے انتظار میں چہل قدمی نہ کرنا چاہیے، چلنے پھرنے کا سلسلہ امکان بھر کم رکھنا چاہیے۔

۱۵۔ لڑکوں کے لیے جو وضو خانے بنے ہوتے ہیں، ان میں گھس پل کر جلدی وضو کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیے، اس سے ابتذال ٹپکتا ہے، وضو کے مقام کے خالی ہونے کا انتظار کرنا چاہیے اور اگر دروازہ بند ہو تو تین مرتبہ کھٹکھٹا کر آہستہ سے کھولنا چاہیے۔

۱۶۔ مدرسہ اور دارالاقامہ کی دیواروں پر پتھر یا کوئلہ سے نشان نہ بنانا چاہیے، اس سے دیوار خراب ہوتی ہے اور نہ گندے ہاتھ دیوار میں پوچھنے چاہئیں، اس سے دیوار گندی ہوتی ہے۔

۱۷۔ راہ میں گذرتے ہوئے دروازوں کی درازوں اور پھاٹوں پر نظر نہ جمانی چاہیے کہ اندر کی چیزیں دکھائی دیں اور اگر دروازہ کھلا ہو تو ادھر سے نگاہ پھیر لینی چاہیے اور اگر اندر سے سلام کی آواز آئے تو جواب دے کر گذر جانا چاہیے۔

۱۸۔ بلند آواز نہ نکالنی چاہیے، نہ پڑھنے میں اور نہ کسی کو پکارنے میں تاکہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو، خصوصاً نمازیوں کے نماز پڑھتے وقت اور درس کے حلقوں میں بہت آہستہ بولنا چاہیے، اسی طرح تکرار مذاکرہ، بحث اور مباحثہ کے موقع پر۔

۱۹۔ اگر مدرسہ جانے کا راستہ کسی کھلی راہ سے ہو تو پورے کپڑے پہن کر جانا چاہیے خاص طور پر سر ننگا نہ رہے۔

۲۰۔ بری عادتوں جیسے راہ چلتے دیکھنا، زور دار قہقہے مارنا، ہر وقت ہزلیات بکتے رہنا، پہلو پر یا چت لیٹے رہنا، اونگھنا، یا بے وقت سونا، ان سب سے پرہیز کرنا چاہیے۔ (۱)

(۱) تذکرۃ السامع از ص ۲۰۹ تا ص ۲۳۶۔

مدارس کے کتب خانے: مدرسوں میں منتظمین کی طرف سے کتب خانے قائم کیے جاتے تھے، جن سے علما اور طلبہ استفادہ کرتے تھے، جب بغداد میں مدرسہ مستنصریہ قائم ہوا تو شاہی کتب خانہ سے ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر چیدہ کتابیں مدرسہ کی عمارت میں منتقل کی گئیں (۱) اسی طرح الحاکم نے مصر میں دارالحکمۃ کے نام سے ایک دارالعلم کھولا تو اس میں وسیع پیمانہ پر کتب خانہ بھی قائم کیا، مقریزی لکھتا ہے:

> ''اس دارالعلم میں امیر المومنین کے خزانہ سے مختلف فنون اور آداب کی کتابوں کا ایسا ذخیرہ جمع کیا گیا جس کی مثال آج تک نہیں دیکھی گئی''۔
>
> ''یہاں ہر شخص کو آکر فائدہ اٹھانے کی عام اجازت دے دی گئی تھی...... بعض لوگ یہاں کتابوں کے مطالعہ کے لیے آتے، بعض انہیں نقل کرنے کے لیے اور بعض سبق پڑھنے کے لیے کتابیں لیتے تھے''۔
>
> ''اس میں لکھنے پڑھنے کی عام ضرورت کی چیزیں، روشنائی، قلم، دوات اور کاغذ بھی لوگوں کے لیے مہیا رکھی جاتی تھیں''۔ (۲)

اسی طرح دوسرے مدرسوں میں کتب خانوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، جیسے مدرسہ ناصریہ مصر کے متعلق ہے:

> ''اس میں اس نے ایک جلیل القدر کتب خانہ قائم کیا''۔ (۳)

مدارس کے شفا خانے: مدرسوں کے لیے اسی کی عمارت کے اندر جداگانہ شفا خانے بھی قائم کیے جاتے تھے، جس میں مدرسہ کے متوسلین علاج و معالجہ کراتے تھے، مدرسہ مستنصریہ کے سلسلۂ عمارات میں اس کے شفا خانہ کے لیے علاحدہ عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ (۴)

ایوان درس: مدرسوں میں درس کے لیے علاحدہ علاحدہ ایوان (ہال) تعمیر کیے جاتے

(۱) مقالات شبلی جلد ۳ ص ۴۶۔ (۲) خطط مصر مقریزی جلد ۱ ص ۴۵۹۔ (۳) ایضاً جلد ۲ ص ۲۸۲۔

(۴) مقالات شبلی جلد ۳ ص ۴۶۔

تھے، جنہیں موجودہ زمانہ کا کلاس روم کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی تقسیم درجوں کے اعتبار سے نہ تھی بلکہ ہر استاد کے لیے درس کا ایوان علاحدہ ہوتا تھا، کبھی ایوان درس کی دیواروں پر زینت کے لیے اشعار لکھتے تھے۔(۱)

مقاماتِ تدریس: درس کے ہر ایوان میں استاد کے لیے مقام تدریس علاحدہ بنایا جاتا تھا، ابن بطوطہ بغداد کے مشہور مدرسہ مستنصریہ کے متعلق لکھتا ہے:

> ''اس مدرسہ میں چاروں مذہبوں کی تعلیم دی جاتی ہے، ہر مذہب کے لیے مسجد (مدرسہ) میں ایک ایک ایوان اور مقام تدریس ہے، مدرس کی نشست لکڑی کے ایک چھوٹے قبہ کے اندر کرسی پر جس پر فرش بچھا ہوتا ہے، ہوتی ہے''۔(۲)

مدرسوں کے عہدہ دار و ملازمین: اسلامی مدرسوں میں حسب ذیل عہدہ دار و ملازمین کا پتہ چل سکا ہے:

۱۔ صدر اساتذہ
۲۔ مرتب مدرسہ
۳۔ اساتذہ
۴۔ معید
۵۔ نقیب
۶۔ خازن
۷۔ دربان

صدر اساتذہ: مدرسوں میں اساتذہ و معلمین کے درمیان فرق مراتب قائم تھا، ہر مدرسہ میں رئیس معلم کے لقب سے ایک صدر اساتذہ ہوتا تھا جو معلمین کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، ابواسحاق شیرازی نظامیہ کے پہلے صدر مدرس تھے اور سسلی کے بعض صدر اساتذہ کا ذکر تاریخ

(۱) وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۴۳۷۔ (۲) رحلہ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۶۷۔

میں آیا ہے۔(۱)

مرتب مدرسہ: مدرسوں میں ''مرتب مدرسہ'' کے لقب سے ایک عہدہ دار ہوتا تھا، جسے شاید موجودہ زمانہ کے مدرسوں کا مہتمم سمجھنا چاہیے، مدرسہ کے انتظامی امور اور نظم ونسق کے مسائل اس سے متعلق رہتے تھے، جیسے شیخ محمد ابن محمد بن احمد معروف بہ ہمام مرتب حربوی متوفی ۶۱۰ھ بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے مرتب تھے۔(۲)

شیوخ واساتذہ: ہر مدرسہ میں مختلف علوم وفنون، قرآن، حدیث، تفسیر، کلام، فلسفہ، صرف ونحو وغیرہ کے لیے علاحدہ علاحدہ معلم ہوتے تھے، جنہیں شیخ کا لقب حاصل ہوتا تھا، وہ اپنے شعبۂ علم کا نگراں ہوتا تھا اور اس کے ماتحت اس کے نائبین ہوتے تھے۔

اساتذہ کا لباس: اساتذہ کا لباس خاص ہوتا تھا، مدرسہ مستنصریہ کے اساتذہ عمامہ باندھتے اور سیاہ عبا پہنتے تھے، درس کے وقت ان کے لیے اس لباس میں ملبوس رہنا ضروری تھا، ابن بطوطہ لکھتا ہے:

> ''مدرس اس (مقام تدریس) پر عمامہ باندھے ہوئے سیاہ لباس پہن کر بیٹھتا ہے، اس سے ایک خاص وقار اور تمکنت ظاہر ہوتا ہے''۔(۳)

اساتذہ کا انتخاب: اساتذہ کا انتخاب بڑی دیکھ بھال سے کیا جاتا تھا، ملک کے مشہور ارباب فضل ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلائے جاتے تھے اور علم ودین کی خدمت کے تخیل کے ساتھ وہ اپنے فرائض انجام دیتے تھے، مدرسہ کے بانی اگر کسی غیر معمولی صاحب فضل وکمال کو کسی گاؤں میں گوشہ نشیں پاتے تو اسے کھینچ کر مدرسہ میں ملا لیتے، مدرسہ نظامیہ کا بانی نظام الملک طوسی کسی ضرورت سے بلخ گیا ہوا تھا، وہاں اسے ایک گاؤں دخش میں ایک صاحب کمال کے عزلت گزیں ہونے کی اطلاع ملی جس نے تحصیل علم میں بڑے بڑے سفر کیے تھے

(۱) مختصر کتاب انباہ الرواۃ علی ابناء النحاۃ درا ماری ص ۲۲۸۔ (۲) الوافی بالوفیات صفدی جلد ۱ ص ۱۵۶۔

(۳) رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۶۷۔

اور حدیثوں کا قیمتی ذخیرہ سینہ میں محفوظ کر لیا تھا، یہ حافظ امام ابوعلی حسن بن علی وخشی تھے، نظام الملک ان کے حالات سن کر مشتاق ہوا اور انہیں بلا کر مدرسہ نظامیہ میں حدیث کی مشیخت کے عہدہ پر سرفراز کیا اور سنن ابوداؤد خود ان سے پڑھی۔(۱)

اساتذہ کی معاشی حالت: جیسا کہ اوپر کہا گیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے معلموں کے وظیفے مقرر ہونا شروع ہوئے، پھر جب مدرسوں کا باقاعدہ نظام جاری ہوا تو ان کی تنخواہیں مقرر ہونے لگیں، مولانا شبلی مرحوم نے ان کی بیش قرار تنخواہوں کا تذکرہ اپنے مقالہ میں فرمایا ہے۔

لیکن یہ تنخواہیں جس قدر بھی بیش قرار ہوں اس عہد کی عام معاشی فراغ بالی اور اربابِ حکومت اور اہل مناصب کی تنخواہوں کے لحاظ سے وہ کم تر تھیں، ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں قاضیوں، مفتیوں، خطیبوں اور معلموں کو ایک زمرہ میں شمار کر کے دکھایا ہے کہ یہ لوگ غیر معمولی دولت وثروت حاصل نہیں کر سکتے، وہ لکھتا ہے:

> ''اس کا سبب یہ ہے کہ کسب اعمال کی قیمت ہوتا ہے اور اعمال کی ضرورتوں کے اختلاف کے لحاظ سے ان کی قیمتوں میں فرق ہوتا ہے، جن کاموں کی تمدنی زندگی میں لوگوں کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے ان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ عوام ان کے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں لیکن ان کاموں یعنی تدریس اور افتا وغیرہ کے پیشوں کی عام لوگوں کو زیادہ حاجت نہیں، ان کی احتیاج زیادہ تر خواص کو ہوتی ہے، عوام عموماً ان سے مستغنی ہوتے ہیں حالاں کہ اپنی جگہ ان کی ضرورت اور اہمیت شدید ہے، اسی لیے حکومت جو معاوضہ کی ذمہ دار ہوتی ہے، وہ ان پیشوں کے فائدوں اور مصلحتوں کا لحاظ کر کے ان صیغوں کا اہتمام خود کرتی ہے، اس لیے ان کی معیشت کے اہتمام کی ذمہ داری بھی حکومت

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۴۴، ۳۴۵۔

پر عائد ہوتی ہے لیکن وہ (بعض دوسرے اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل کسی دوسری جگہ بیان کی گئی ہے) انہیں بڑے عہدہ داروں کے مساوی معیشت مہیا نہیں کرتی ہے، پھر دوسری طرف ان پیشوں کے لوگ اپنے علم اور فضل کی وجہ سے زیادہ خوددار ہوتے ہیں، اس لیے وہ ذلت نفس اٹھا کر رزق کی طلب کے وہ وسائل اختیار نہیں کرتے جنہیں عام لوگ کام میں لا کر معیشت بہم پہنچاتے ہیں اس لیے وہ لوگ عموماً زیادہ دولت مند نہیں ہوتے ہیں"۔

اس کے بعد لکھتا ہے:

"میں نے اپنا یہ نظریہ بعض ارباب فضل سے بیان کیا تھا لیکن انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا، حسن اتفاق کہ مجھے مامون کے دفتروں کے بعض حسابوں کے پھٹے ہوئے اوراق ہاتھ آئے جو بہت سے آمد و خرچ کے حسابوں پر مشتمل تھے، ان کے مطالعہ سے تعجب انگیز طور پر میرے اوپر کے بیان کی تصدیق ہوئی"۔(۱)

البتہ جو اہل علم دوسرے ذرائع سے دولت جمع کر لیتے تھے اور اپنے ذوق سے خود مدرسے قائم کرتے تھے، ان کی مثال اس سے علاحدہ ہوگی، جیسا کہ ابن بطوطہ نے بعض شہروں کے علما اور فضلا کی دولت مندی کا تذکرہ کیا ہے، اس کے ماسوا ہر دور میں ایسے اہل علم بھی پائے جاتے تھے جو اپنی پرہیزگاری کی بنا پر تعلیم کی اجرت لینا جائز نہیں سمجھتے تھے اور معاش کے حاصل کرنے کے لیے کوئی دوسری سبیل نکالتے اور بقدر ضرورت حاصل کر کے گذر اوقات کرتے اور تعلیم اور تعلم میں مشغول رہتے بلکہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں تعلیم کا معاوضہ لینے کی ممانعت کی ہے۔(۲)

معید: ہر ایوان درس میں ایک یا دو "معید" ہوتے تھے جو استاد کے درس اور املا کا اعادہ

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۳۲، ۴۳۳۔ (۲) احیاء العلوم کتاب العلم۔

کرتے جاتے تھے، ابن بطوطہ اسی سلسلۂ بیان میں کہتا ہے:

"اس (استاد) کے دائیں بائیں دو معید ہوتے ہیں، وہ ہر فقرہ کو جو استاذ لکھاتا ہے، دہراتے جاتے ہیں۔
درس کی ان چاروں مجلسوں میں سے ہر مجلس میں بھی ترتیب اور نظام قائم ہے"۔(۱)

معید کی حیثیت لڑکوں سے بلند اور استاذ سے فروتر ہوتی تھی، حوالہ کی کتابوں کا مراجعہ کرنا بھی اسی کا کام تھا، جیسے ابو اسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف شیرازی جو آگے چل کر مدرسہ نظامیہ بغداد کے سب سے پہلے صدر معلم نامزد ہوئے تھے، اپنے استاذ ابوالطیب طبری کے درس کے حلقہ میں معید استاذ اور بعد میں مدرسہ نظامیہ میں صدر معلم مقرر ہوئے۔(۲)

معید کے فرائض اور ذاتی اوصاف میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ نیکوکار اور صاحب فضل ہو، اگر کسی وقت لڑکوں کی طرف سے کوئی نا ملائم برتاؤ ظاہر ہو، تو صبر اور ضبط کر سکتا ہو، انہیں فائدہ پہنچانے کا خواہاں ہو اور انہیں اپنے فرائض کی ادائی پر مستعد رکھ سکتا ہو(۳) وہ لڑکوں کے ساتھ دارالاقامہ ہی میں مقیم رہے اور ان کی تکرار اور مطالعہ میں جب کوئی دقت پیش آئے اور وہ استاذ کے درس اور املا کو بھول گئے ہوں تو اس وقت بھی وہ اس کے ضروری حصے دہرائے بلکہ قاضی ابن جماعہ کا بیان ہے کہ معید کا نام "معید" اسی موقع کی مناسبت سے پڑا ہے کہ وہ خارج وقتوں میں درس کا اعادہ کرتا ہے۔(۴)

معید کا منصب دسویں صدی ہجری تک مدرسوں میں باقی تھا، صاحب الشقائق النعمانیہ، مصلح الدین مصطفٰی معروف بابن البرکی زادہ متوفی ۹۱۹ھ کے متعلق لکھتا ہے:

"یہ بعض قاضیوں کی اولاد میں سے تھے، اپنے زمانہ کے مشہور علما سے تعلیم

---

(۱) رحلہ ابن بطوطہ جلد۱ ص ۱۶۷۔ (۲) وفیات الاعیان جلد۱ ص ۷۵۔ (۳) تذکرۃ السامع ص ۲۰۱۔
(۴) ایضاً ص ۲۰۴۔

حاصل کی، پھر مولیٰ قاسم معروف بہ قاضی زادہ کی خدمت سے وابستہ ہوئے، پھر ان کے درس کے حلقہ کے معید قرار پائے، اس کے بعد بعض مدرسوں میں استاذ مقرر ہوئے، پھر سلطان بایزید نے انہیں اپنے لڑکے سلطان احمد کا معلم بنایا، اس کے بعد سلطنت کے آٹھ مدرسوں میں سے ایک مدرسہ ان کے سپرد کیا گیا''۔(۱)

نقیب درس: درس کے ہر ایوان میں ایک نقیب ہوتا تھا، اس کے لیے ذہین اور موقع شناس ہونا ضروری تھا، وہ مجلس کی مناسب ترتیب قائم رکھتا، حاضرین کو ان کے مرتبہ کے مطابق بٹھاتا، لڑکوں کو مجلس کے آداب کے برقرار رکھنے اور درس کو توجہ سے سننے اور مجلس کے حاضرین کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا، غرض وہی مجلس کے جملہ انتظام وانصرام کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔(۲)

قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

''ہر حلقہ کے استاد کے لیے ایک نقیب ضروری ہے جو ہشیار، تیز اور جری ہو، حاضرین میں ترتیب قائم کر سکے اور جو لوگ حلقہ میں آئیں، انہیں ان کے مرتبہ کے مطابق بٹھائے، سونے والوں کو بیدار کرے، طالب علموں کو جو کچھ کرنا ہے، اس کے نہ کرنے پر اور جو نہ کرنا چاہے اس کے کرنے پر تنبیہ واشارہ کرے اور سبقوں کے سننے کی ہدایت کرے اور سبق کے درمیان خاموشی قائم رکھے''۔(۳)

خازن: اس کی نگرانی میں مدرسہ کا کتب خانہ ہوتا تھا۔

دربان: اگرچہ درس کے ایوان کا دروازہ ہر صاحب علم وطالب علم کے لیے ہر وقت کھلا

(۱) الشقائق النعمانیہ حاشیہ وفیات الاعیان جلد اص ۴۲۷۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۱۴۱۔ (۳) ایضاً۔

رہتا تھا، تاہم مدرسوں کی دہلیز پر دربان مقرر رہتے تھے جو درس و تدریس کے وقتوں میں مدرسہ میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتے تھے اور غیر متعلق اور ضروری اشخاص کو اندر جانے سے روکتے تھے۔(۱)

بچوں کے آغاز تعلیم کی عمر: اس زمانہ میں بڑی کم عمری کے زمانہ میں بچوں کی تعلیم شروع کرا دیتے تھے، ہندوستان میں ۴ سال ۴ مہینے اور ۴ دن کی عمر میں بچوں کے مکتب کرنے کا جو رواج ہے، اس کا پتہ مغل سلاطین کے عہد سے چلتا ہے چنانچہ بابر نے ہمایوں کا مکتب اسی عمر چار سال چار مہینے اور چار روز میں کرایا(۲) پھر ہمایوں نے اپنے لڑکے اکبر کو بھی اسی عمر میں مکتب کے لیے بٹھایا، اکبر نامہ میں ہے:

"از ہفتم شوال ایں سال کہ از عمر ابد پیوند، حضرت شہنشاہی چہار سال و چہار ماہ و چہار روز شدہ بود، بآئین رسم و عادات آن آموختہ درس گاہ الٰہی و رموز دان دبستان ربانی را در مکتب بشری درآوردند"(۳)

اگر چہ اس تعیین وتحدید کا ذکر عربی و اسلامی ملکوں کے علما کی طالب علمی کے حالات میں نظر نہیں آیا، مگر ان ملکوں میں بھی اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے تقریباً اسی عمر سے بٹھا دیتے تھے اور وہ ابتدائی نوشت و خواند سے جلد فرصت پا کر آٹھ دس سال کی عمر میں پہنچتے پہنچتے مختلف علوم کے مبادیات حفظ کر لیتے تھے اور سن شعور میں داخل ہوتے ہی علوم کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہو جاتے تھے، امام شافعی فرماتے ہیں:

"میں جب مالک ابن انس کی خدمت میں حاضر ہوا تو موطا حفظ کر چکا تھا، انہوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ کسی کو بلاؤ جو تمہارے لیے موطا پڑھے، میں نے کہا میں خود موطا کا قاری ہوں چنانچہ میں نے برزبان ان کے سامنے موطا

---

(۱) خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۸۲۔ (۲) پروموشن آف مجڈن لرننگ نریندر ناتھ لا ص ۱۲۸ بحوالہ تذکرۃ السلاطین۔

(۳) اکبر نامہ جلد ۱ ص ۲۹۶۔

پڑھی''۔(۱)

خطیب بغدادی کہتے ہیں:

''میں نے سب سے پہلے گیارہ سال کی عمر میں حدیث سنی، کیوں کہ میں یوم شنبہ ۲۴ر جمادی الاخری ۳۹۲ھ کو پیدا ہوا اور میں نے پہلی مرتبہ محرم ۴۰۳ھ میں حدیث پڑھی''۔(۲)

ابوالعباس احمد بن یحیٰ معروف بہ ثعلب نحوی کہتا ہے:

''میں نے عربی زبان اور لغت کی تحصیل ۲۱۶ھ میں شروع کی اور فراء نحوی کے مسائل پر ۱۸ سال کی عمر میں غور کرنے لگا اور ۲۵ سال کی عمر تک پہونچ کر فراء کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو میرے لیے اچھوتا رہ گیا ہو بلکہ مجھے یاد نہ ہو گیا ہو''۔(۳)

حضرت حسن فرماتے ہیں:

''بچپن میں علم کی تحصیل پتھر کی لکیر کے مانند ہوتی ہے''۔(۴)

مدت تعلیم و تحصیل: طلبہ کی تعلیم کے زمانہ کی کوئی حد مقرر نہیں تھی اور نہ علم کی تحصیل کے لیے کسی عمر کی قید تھی، زرنوجی کہتا ہے ''علم کی تحصیل کا زمانہ مہد (گہوارہ) سے لحد تک ہے، بہر حال جب تک جس کے حالات اجازت دیتے اس زندگی کو قائم رکھتا چنانچہ اہل علم کے سوانح میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ تعلیم اور تحصیل سے فارغ ہو جانے کے باوجود برسوں استاد کی خدمت میں زندگی گذار دیتے تھے اور استاذ اور معلم کہے جانے کے بجائے شاگرد اور متعلم کہلانا فخر سمجھتے تھے لیکن پھر وہ اپنے شیخ کے درس کی مسند سے ایسے بن کر اٹھتے کہ اس کی وفات پر اس کی جانشینی کر سکتے تھے، مثلاً ابن خلکان کا بیان ہے کہ عبداللہ بن وہب مالکی جو

(۱) وفیات الاعیان جلد ا ص ۵۶۶۔ (۲) ابن عساکر جلد ا ص ۳۹۷۔ (۳) وفیات الاعیان جلد ا ص ۵۱۔
(۴) تعلیم المتعلم ص ۴۰۔

مصر میں امام مالک کے جانشین سمجھے گئے، وہ امام مالک کی خدمت میں بیس سال تک تحصیل علم میں مصروف رہے تھے"۔(۱)

ابو اسحاق شیرازی جو مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر معلم تھے، اپنے استاذ قاضی ابوالطیب کی مجلس میں دس سے زیادہ مدت تک مسلسل شریک رہے۔(۲)

حاکم صاحب المستدرک نے شیخ ابوالحسین محمد بن محمد بن یعقوب نیشاپوری متوفی ۳۶۸ھ کی صحبت میں تحصیل و تعلم کے لیے ۲۰ سال سے زیادہ گذار دیے۔(۳)

اسی طرح امام احمد بن حنبل غندر کے متعلق اور ابوالولید طیالسی، یحیٰی بن سعید کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں نے شعبہ کی صحبت میں کامل بیس سال گذارے تھے اور ابوعوانہ نے تو یزید بن زریع کی خدمت میں چالیس سال بسر کر دیے۔(۴)

نیز طلبہ اپنے استادوں اور دوسرے مصنفوں کی خدمت میں ان کی کتابوں کی قرأت اور سماع کی سند کے لیے قیام کرتے تھے اور اس میں بھی سالہا سال لگ جاتے تھے، ابن مغربی کا بیان ہے کہ میں ابن حزم کے ساتھ سات برس تک رہا اور ان سے ان کی تمام تصنیف سنیں (۵) تاہم اس کا یہ مقصد نہیں کہ سست رفتاری سے ساری عمر طالب علمی کا سلسلہ قائم رکھتے تھے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا نوجوانی کے زمانہ کو علم کی تحصیل میں پورے انہماک سے صرف کرتے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں "اپنے فراغت نشاط اور عافیت اور نوجوانی کے زمانہ کو غنیمت جانو....." حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "فقہ کی تحصیل بال سپید ہونے سے پہلے کرلو" امام شافعی فرماتے ہیں "سردار بننے سے پہلے حاصل کرلو، جب سرداری آجائے گی تو علم حاصل نہ کرسکو گے" پھر لکھتے ہیں:

"لیکن علم کے کمال کے باوجود اپنے کو مشائخ سے مستغنی نہ سمجھو"۔

---

(۱) وفیات الاعیان جلد ا ص ۴۴۵۔(۲) وفیات الاعیان جلد ا ص ۶۔(۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۴۱۔

(۴) ایضاً جلد ۳ ص ۱۸۳، غندر ۲۷ (سعید) ۲۳۶ (ابوعوانہ)۔(۵) ایضاً ص ۳۲۲۔

قاضی ابن جماعہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

''اپنی جوانی اور عمر کے وقتوں کو تحصیل میں لگانے میں عجلت کرو کیوں کہ عمر کی جو گھڑی گذرتی ہے اس کا بدل کوئی دوسرا موجود نہیں''۔(۱)

جب جس طالب علم کی تعلیم ختم ہوتی تھی، وہ مدرسہ سے رخصت ہوتا تھا اور لڑکے مختلف ملکوں میں مختلف مدتوں فارغ ہوتے تھے، جیسے ابن خلدون لکھتا ہے کہ مغرب کے عام شہروں میں مدرسوں میں عموماً ۱۶ سال میں تعلیم ختم کراتے تھے لیکن شہر تیونس میں صرف پانچ برس میں لڑکوں کو پڑھا کر تیار کر دیتے تھے۔

علما اور طلبہ کی جسمانی ریاضت: اگرچہ موجودہ زمانہ کی ورزشوں کے نظام کے مثل اسلامی مدرسوں کے نظام اور دستور العمل میں کوئی مستقل انتظام نہ تھا لیکن علما و طلبہ اپنی جسمانی ریاضت کا خاص اہتمام کرتے تھے، تیر اندازی اور اسپ سواری ان کی مشہور ورزشیں تھیں۔

صحیح بخاری میں اس گھوڑ دوڑ کا ذکر آیا ہے، جس کا اہتمام آنحضرت ﷺ نے خود فرمایا تھا اور حضرت عبد اللہؓ بن عمر بھی گھوڑے پر سوار تھے، اونٹوں کی دوڑ بھی مشہور ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کی اونٹنی دوڑی تھی (۲) حضرت ابن عون کے متعلق روایت ہے کہ وہ گھوڑے کی سواری کا شوق رکھتے تھے اور ایک مرتبہ میدان میں گھیر کر گورخر کا شکار کیا تھا (۳) امام شافعی کو تیر اندازی میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ قریش میں کوئی دوسرا شخص ان کے ایسا موجود نہ تھا، وہ ایک ساتھ دس تیروں سے دس نشانے مارتے تھے (۴) امام بخاری اکثر میدان میں گھوڑے پر نکل جاتے اور تیر اندازی کی مشق کرتے، ان کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ ان کے تیر کم خطا کرتے تھے (۵) نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان

(۱) تذکرۃ السامع ص ۷۰ و ۳۴۔ (۲) صحیح بخاری۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۱۴۰۔ (۴) ایضاً جلد ا ص ۳۳۱۔ (۵) مقدمہ فتح الباری ص ۵۶۶۔

خاں صاحب شروانی نے علمائے سلف میں ''جسمانی ریاضت'' کا عنوان قائم کر کے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔(۱)

مدرسوں میں بھی اگرچہ ورزشوں کا انتظام موجودہ زمانہ کے مثل نہ تھا مگر ماہرین تعلیم نے مدرسہ کے لڑکوں کو جسمانی ریاضت میں خاص طور پر چہل قدمی کرنے کا مفید مشورہ دیا ہے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

> ''ٹہلنے اور جسم کی ریاضت کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے کیوں کہ وہ حرارت برانگیختہ کرتے ہیں، ردّی فضلات زائل کرتے ہیں اور بدن میں نشاط پیدا کرتے ہیں''۔(۲)

نیز مختلف علما کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پابندی سے جسمانی ریاضت کا اہتمام کرتے تھے، ابن بطوطہ مصر کے بعض علما کے متعلق لکھتا ہے:

> ''ان ہی میں قوام الدین کرمانی ہیں، ان کی سکونت جامع ازہر کی اوپر کی منزل میں ہے، ان کے حلقہ میں فقیہوں اور قاریوں کی ایک جماعت ہے جو ان سے وابستہ رہتی ہے اور ان سے مختلف فنون کا درس لیتی ہے اور فتاوی دیتی ہے، ان کے لباس میں موٹے اور بھدے اون کی ایک عبا اور سیاہ اونی عمامہ ہے۔
>
> ان کے روزانہ کے معمولات میں یہ داخل ہے کہ وہ عصر کی نماز کے بعد فرحت بخش مقاموں اور تفریح گاہوں میں اپنے ساتھیوں سے علاحدہ ہو کر تنہا چلے جاتے ہیں''۔(۳)

حقیقت میں اس زمانہ میں لڑکوں اور معلموں کے ذمہ مختلف فرائض اس قدر تھے کہ ان کی ورزش آپ سے آپ ہو جاتی تھی اور وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں سے زیادہ صحیح اور تندرست رہتے تھے، انھیں علاحدہ ورزش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ

---

(۱) علمائے سلف، ص ۱۲۷ و ۱۲۸ طبع دوم۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۸۰۔ (۳) ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۳۰۔

اس زمانہ میں پا پیادہ چلنے کا رواج خاص طور پر علم کی طلب میں بہت زیادہ تھا، لوگ سیکڑوں میل پا پیادہ سفر کر ڈالتے تھے، اس لیے ان کے ٹہلنے اور پیدل چلنے کی مشق جاری رہتی تھی، جس کی عادت اس زمانہ کی شہری زندگی میں کم لوگوں کو رہ گئی ہے، اس لیے اگر موجودہ اور پچھلے زمانہ کے لوگوں کی عمر کا اوسط نکالا جائے تو اس زمانہ کے لوگ بڑی عمروں کے ثابت ہوں گے۔

نزہت گاہوں کی سیر اور دوسرے تفریحی مشاغل: سیر و تفریح کا مدرسوں میں بھی لحاظ رکھا جاتا تھا، جب لڑکے درس و مطالعہ سے تھک جاتے تو فرصت کے وقتوں میں نزہت گاہوں کی سیر کا مشورہ دیا جاتا تھا، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

"اگر دل دماغ اور ذہن اور نگاہ تھک جائے یا کمزوری معلوم ہو تو سیر گاہوں میں سیر اور تفریح کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاکہ پہلی حالت پھر لوٹ آئے"۔(۱)

اساتذہ وعلما بھی سنجیدہ علمی مشغلوں سے تھک کر تفریح کے لیے دوسرے دلچسپ مشاغل اختیار کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ جب حدیث بیان کرتے کرتے تھک جاتے تو شاگردوں سے فرماتے کہ "جاؤ شعرا کے دیوان اٹھالاؤ"۔(۲)

ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابونصر فارابی اپنے دمشق کے قیام کے زمانہ میں زیادہ تر کسی آبشار کے پاس یا کسی باغ کے چمن میں بیٹھ کر اپنی کتابیں تصنیف کرتا تھا اور اس کے حاجت مند وہیں جا کر اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔(۳)

اہل علم کبھی کبھی باغوں میں دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے، مشہور محدث ابن خزیمہ نے ۳۰۹ھ میں باغ میں بڑے پیمانہ پر ایک دعوت دی تھی جس میں شہر کے تمام محدثین اور طلبہ شریک ہوئے تھے۔(۴)

(۱) تذکرۃ السامع ص۷۹۔ (۲) تعلیم المتعلم ص۵۱۔ (۳) وفیات الاعیان جلد۲ص۱۰۳۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ جلد۲ص۲۶۳۔

طریقۂ تادیب: قاضی ابن جماعہ لڑکوں کی سرزنش کا طریقہ یہ بتاتے ہیں کہ اگر کسی طالب علم سے کوئی بات تہذیب کے خلاف سرزد ہو تو اس شخص کے سامنے نرمی سے سمجھایا جائے، جس کے سامنے بدتہذیبی کی گئی ہو، اگر وہ باز نہ آئے تو پوشیدہ طور پر اسے سمجھایا جائے، گر یہ بھی کارگر نہ ہو تو اسے سخت الفاظ میں علانیہ تنبیہ کی جائے اور اگر یہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئے تو اس صورت میں اس لڑکے کو علاحدہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، خصوصاً اگر اس کا اثر دوسرے طالب علموں میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو۔(۱)

یحیٰی بن محمد بن یحیٰی بن سلام کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاضی اسد بن فرات درس میں مصروف تھے، درس کے اثناء میں رویت باری سے متعلق ایک حدیث آئی، شاگردوں کی صف میں سلیمان الفرا جس نے بعد میں سلیمان المعتزلی کے نام سے شہرت حاصل کی، مجلس کے اخیر میں بیٹھا تھا وہ اس وقت تک بدعتیوں کے عقیدوں سے کچھ متاثر ہو چکا تھا، اس نے اس حدیث پر کوئی اعتراض کیا پھر رویت باری کے عقیدہ سے مجلس میں علانیہ انکار کر بیٹھا، اسکا طرز عمل گستاخانہ تھا، یہ دیکھ کر قاضی اسد سخت برہم ہوئے اور غیظ وغضب میں اٹھ کر سلیمان کی داڑھی اور گردن پکڑ لی اور بے تحاشا مارتے مارتے لہولہان کر دیا، اس کے بعد اپنے درس کے حلقہ سے نکال دیا۔(۲)

قاضی اسد بن فرات کا یہ طرز عمل درحقیقت موجودہ زمانہ کے ''رسٹیکیت'' کے طریقہ کے مانند ہے کہ یہ سزا ایسے موقعوں پر دی جاتی ہے جب کسی طالب علم سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جس کے دوسرے طلبہ میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو چنانچہ اس موقع پر بھی سلیمان المعتزلی کے رویت باری کے عقیدہ سے انکار کا اثر حلقہ کے دوسرے لڑکوں تک پھیل سکتا تھا، اس لیے جیسا کہ قاضی ابن جماعہ نے کہا ہے کہ اگر اس کا اثر دوسرے لڑکوں تک پھیل سکتا ہو تو اسے مدرسہ سے خارج کر دینا چاہیے، قاضی اسد نے اسی کے مطابق اپنا

(۱) تذکرۃ السامع ص ۶۱۔ (۲) تاریخ صقلیہ جلد ۲ ص ۲۸۶۔

طرز عمل اختیار کیا، ورنہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مسلمان ماہرین تعلیم لڑکوں کو عام طور پر پاداش میں سنگین سزائیں دینے کے حامی تھے، جیسا کہ ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک نے شیخ سعدی کی گلستاں کے ایک قصہ اور جرمن سیاح اولیاریوس کے ایران کے ایک مکتب میں مشاہدہ سے قیاس کر کے یہ رائے قائم کی ہے کہ اسلامی مدرسوں میں لڑکوں کے ساتھ سختی اور بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ:

''اسلامی مکاتب میں بچوں کی محبت کو راہ نہ تھی''۔(۱)

اسلامی مدارس میں استاذ بچوں کے ساتھ کس قسم کی پدرانہ شفقت سے پیش آتے تھے، اس کا اندازہ آگے چل کر ہوگا، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ مسلمان ماہرین تعلیم لڑکوں پر جبر وتشدد کے کیے جانے اور انہیں سخت سزائیں دینے کے سخت مخالف تھے، قاضی ابن جماعہ کا بیان اوپر گذرا، ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتا ہے:

''تعلیم میں سختی طلبہ خصوصاً چھوٹے بچوں کے لیے سخت مضر ہے طالب علم کی تربیت کا دارومدار سختی پر ہوگا تو اس کا انبساط ونشاط فنا ہو جائے گا اور یہ سختی اس میں کاہلی اور سستی پیدا کرے گی اور سزا سے بچنے کے لیے اس کو جھوٹ اور نفاق اور مکر وفریب کی طرف مائل ہونا پڑے گا اور یہ چیزیں اس کی ایک عادت بلکہ اس کا خلق بن جائیں گی اور انسانیت کی اجتماعی خصوصیتیں یعنی حمیت اور مدافعت فنا ہو جائیں گی اور وہ اس میں دوسروں کا محتاج ہو جائے گا۔

جس قوم نے اس قسم کے جبر وتشدد کے ساتھ زندگی بسر کی، اس میں یہ تمام بد اخلاقیاں پیدا ہو گئیں، یہود کو دیکھو کہ ان کی بد اخلاقیاں یعنی ان کی خباثت اور مکاری کس قدر ضرب المثل ہو گئی ہے، اس بنا پر طالب علم کے متعلق معلم کا اور بچے کے متعلق باپ کا فرض یہ ہے کہ ان کی تادیب میں جبر واستبداد کا طریقہ نہ

(۱) اسلامی نظام تعلیم ص ۱۴۰۔

اختیار کریں، محمد بن ابو زید نے معلموں اور متعلموں کے احکام کے متعلق جو کتاب لکھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ بچوں کے مؤدب کو بوقت ضرورت تین بید سے زیادہ لگانا سزاوار نہیں۔

تعلیم کا بہترین طریقہ وہ ہے جس کی تلقین رشید نے اپنے بیٹے امین کے معلم کو کی تھی، اس نے کہا کہ اے احمر! امیر المومنین نے اپنی روح اور اپنے دل کا پھل تیرے سپرد اور تیرے ہاتھ کو اس پر دراز اور تیری اطاعت کو اس پر واجب کر دیا، اب امیر المومنین نے تیرا جو درجہ مقرر کیا ہے اس پر قائم رہ، اس کو قرآن پڑھا، اس سے اشعار کی روایت کروا، اس کو احادیث سکھا اور ہنسنے کے اوقات کے علاوہ اس کو ہنسی سے روک، کوئی وقت ایسا نہ گذرنے پائے کہ تو اس کو کوئی فائدہ نہ پہونچائے لیکن اس کے ساتھ اس کو غمگین نہ کر کہ اس کا ذہن مردہ ہو جائے اس قدر نرمی بھی نہ اختیار کر کہ وہ عیش وفراغ کا خوگر ہو جائے، جہاں تک ممکن ہو تقرب وتلطف کے ساتھ اس کی تربیت کر لیکن اگر وہ اس سے متاثر نہ ہو تو تو سختی کر سکتا ہے"۔(۱)

امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں طلبہ پر سختی کرنے کی ممانعت کی ہے لکھتے ہیں:

"چوتھا فرض جو پیشہ تعلیم کی باریکیوں میں ہے، وہ یہ ہے کہ طالب علم کو بداخلاقی سے اشارہ اور کنایہ میں جہاں تک ممکن ہو روکا جائے اور اس کی تصریح نہ کی جائے اور مہربانی کا طریقہ رکھا جائے، ڈانٹ ڈپٹ نہ کی جائے کیوں کہ تصریح ہیبت کا پردہ چاک کر دیتی ہے اور مخالفت کی جرأت دلاتی ہے اور اس بداخلاقی پر اصرار کرنے کی حرص پیدا کرتی ہے، اس کے علاوہ اشارہ وکنایہ اچھی طبیعتوں کو اپنے معانی کے سمجھنے اور نکالنے کی طرف مائل کرتی ہے اور اس کے

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۹ تا ۶۲۰۔

معنی کا سمجھنا اس پر عمل کرنے کی ترغیب دلاتا ہے"۔(۱)

قاضی ابن جماعہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

"اگر کسی طالب علم سے کوئی بات سرزد ہو تو جھڑک دینے اور سختی کرنے کے بجائے نرمی اور مہربانی سے نصیحت کی جائے اور اس کا مقصد اس میں حسن تربیت پیدا کرنا، اس کے اخلاق کا سنوارنا اور اس کی حالت کا درست کرنا ہو، اگر وہ طالب علم اشارہ سے سمجھ سکے تو تصریح سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر وہ تصریح کیے بغیر نہ سمجھ سکتا ہو تو اسی طریقہ سے سمجھایا جائے اور بہ تدریج اس کی تربیت کی جائے اور اسے اچھی عادتیں سکھائی جائیں اور عمدہ اخلاق اختیار کرنے کا شوق دلایا جائے اور شرعی طریقہ پر اسے اچھی باتوں کے اختیار کرنے کی تلقین کی جائے"۔(۲)

سالانہ امتحان: اسلامی ملکوں کے مدرسوں میں سالانہ امتحان کا طریقہ رائج تھا یا نہیں، اس کی تصریح نظر سے نہیں گذری البتہ ہندوستان میں بیجاپور میں عادل شاہ نے نظام تعلیم کے چند اصول وقواعد بنائے تھے، جن میں طالب علموں کے سالانہ امتحان کے لیے جانے اور انہیں انعامات دیے جانے کی تصریح موجود ہے۔

"وہر سال امتحان می شود و از انعام ہوں سرفرازی فرمودند"۔(۳)

تعطیل: اسلامی مدرسے موجودہ زمانہ کے برخلاف ہفتہ میں ایک دن کے بجائے سہ شنبہ اور جمعہ کو دو دن بند کیے جاتے تھے کیوں کہ اس زمانہ میں لڑکوں کے ذمہ کتابوں کے نسخ کرنے کی ذمہ داری بھی تھی، اس لیے وہ ان تعطیل کے دنوں میں اس کام کو کرتے، قاضی ابن جماعہ ایک سلسلہ میں لکھتے ہیں:

---

(۱) احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم، باب آداب المعلم والمتعلم۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۵۰۔ (۳) بساتین السلاطین ص ۳۵۱۔

''اگر طالب علم سے یہ روزانہ انجام نہ پاسکے تو چھوٹے ہوئے کاموں کو سہ شنبہ اور جمعہ کی رات میں کرلیں''۔(۱)

(کیوں کہ ان دونوں راتوں میں درس کے لیے مطالعہ نہیں کرنا ہوتا)

صاحب الشقائق النعمانیہ اس سے زیادہ واضح طور پر ایک سلسلۂ بیان میں لکھتا ہے:

''اور ان کے حالات میں یہ بھی ہے کہ ان کے زمانہ تک لڑکوں کو منگل اور جمعہ کے دن چھٹی ہوتی تھی، مولیٰ موصوف نے دوشنبہ کا دن بھی اس میں بڑھا دیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں علامہ تفتازانی کی کتابوں کو شہرت حاصل ہوئی اور لڑکے ان کے پڑھنے کے مشتاق ہوئے اور یہ کتابیں قیمت سے بھی دستیاب نہیں ہوتی تھیں کیوں کہ ان کے نسخے زیادہ شائع نہیں ہوئے تھے، اس لیے وہ ان کے لکھنے پر مجبور ہوئے اور جب لکھنے کے وقت میں تنگی دکھائی دی تو مولیٰ موصوف نے تعطیل کے دنوں میں دوشنبہ کا اضافہ کردیا''۔(۲)

موسمی تعطیلات: اسلامی مدرسوں میں تہواروں کے علاوہ موجودہ زمانہ کی طرح موسمی تعطیلات کا رواج تھا یا نہیں اس کی تعیین دشوار ہے، تاہم بعض مستشرقین کا نفی میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے، قاضی ابن جماعہ کا یہ بیان اس سلسلہ میں غور کرنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:

''بعض بڑے علما اپنے شاگردوں کے ساتھ سال کے بعض حصوں میں تفریح کے بعض مقامات میں جاتے تھے اور وہاں تفریح حاصل کرتے تھے''۔(۳)

اور قاضی ابن جماعہ نے سخت گرمی اور جاڑے کے وقت درس وتدریس کی ممانعت کی ہے۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۳۵۱۔(۲) الشقائق النعمانیہ بر حاشیہ ابن خلکان جلد اص ۳۰، ۳۱۔(۳) تذکرۃ السامع ص ۸۲۔(۴) ایضاً ص ۳۳۔

(۴)

اساتذہ کے فرائض

اسلامی مدارس کے معلموں کے فرائض چند نوعیتوں کے تھے، ایک خود ان کی سیرت وکردار پر چند قیود عائد تھے، دوسری اساتذہ اور طلبہ کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ان کے ذمہ چند واجبات تھے پھر ان کے حلقۂ درس میں ان کے بعض معمولات مقرر تھے۔

ان میں سے دونوں اول الذکر کا اجمالی بیان ذیل میں پیش ہے اور آخر الذکر کی تفصیل حلقۂ درس کے بیان میں آئے گی۔

اساتذہ کی ذاتی سیرت واوصاف: اسلامی دور تعلیم میں استادوں اور لڑکوں کے تعلقات روحانی باپ اور بیٹوں کے طور پر قائم تھے۔

اساتذہ لڑکوں کے صرف تعلیمی مشاغل کے ذمہ دار نہ تھے، بلکہ ان میں روحانی پاکیزگی اور بلند اخلاق پیدا کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا، اس لیے جس طرح ایک گھر میں باپ اپنے بچوں کی آئندہ زندگی کے لیے نمونہ ہوتا ہے، اسی طرح اساتذہ کی زندگی طلبہ کے لیے اسوۂ عمل تھی، اس لیے ضروری تھا کہ اساتذہ بھی ذاتی طور پر کامل دیندار اور محاسن اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کے سراپا پیکر ہوں، اس لیے اسلام کے تعلیمی دستور العمل میں شاگردوں کو ان کے تعلیمی فرائض کے ساتھ تربیت اور تہذیب نفس کے اصول بتائے گئے ہیں۔

اسی طرح استادوں کی دینداری، تہذیب اخلاق اور طرز زندگی پر نگاہ رکھی گئی ہے۔

چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے اپنی کتاب میں استادوں کے آداب میں جو باب باندھا ہے اس میں ان ہی اصول کی تشریح کی ہے، تقریباً ان ہی اصولوں کے مانند امام غزالی نے بھی احیاء العلوم جلد اول کتاب العلم میں اساتذہ کے اوصاف اجمال کے ساتھ بیان کیے ہیں، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

''استادوں کے لیے ذیل کے چند ذاتی اوصاف ضروری ہیں:

خوف خدا: علما اور اساتذہ پر واجب ہے کہ وہ بزم وخلوت ہر جگہ اپنے تمام اقوال وافعال اور حرکات وسکنات میں خوف خداوندی ملحوظ رکھیں کیوں کہ جو علوم انہیں ودیعت کیے گئے ہیں، ان کے حقیقی نگہبان اور امانت دار وہی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْآ اَمَانَاتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (انفال۔ ع ۳)	اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو، تم (خیانت کے وبال سے واقف ہو۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِمْ شُهَدَآءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ۔ (مائدہ۔۵:۴۴)	کیوں کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور وہ اس کی حفاظت کرتے بھی رہے، لوگوں سے نہ ڈرو ہم سے ڈرو۔

وقار ومتانت: علما کی زندگی متانت اور وقار کی ہونی چاہیے، امام شافعی فرماتے ہیں:

''علم صرف یہ نہیں ہے کہ علم کی چیزیں رٹ لی جائیں، علم کے لیے متانت وقار، خشوع وخضوع اور خاکساری پر عمل کرنا اور قائم رہنا ضروری ہے''۔(۱)

قتیبہ امام مالک کے درس کی مجلس کے متعلق کہتے ہیں:

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۵، ۱۶۔

"امام مالک کی مجلس وقار، حلم اور علم کی مجلس تھی، وہ پروقار اور اچھی خصلتوں والے تھے، ان کی مجلس میں شور اور ہنگامہ نہ تھا اور نہ آواز بلند ہوتی تھی"۔(۱)

امام مالک خلیفہ ہارون رشید کے نام ایک نصیحت نامہ میں فرماتے ہیں:

"جب تم علم حاصل کرو، تو علم کی نشانیاں، متانت، وقار اور حلم بھی اپنے اندر پیدا کرو، کیوں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ علما رسولوں کے وارث ہوتے ہیں"۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے:

"علم حاصل کرو اور اس کے لیے متانت اور وقار پیدا کرو"۔(۲)

شریعت کی پابندی: شریعت کی پابندی کرنا معلموں اور عالموں کا سب سے پہلا فرض ہے، وہ اسلامی شعائر اور ظاہری احکام کے پورے پابند ہوں، خاص طور پر مسجدوں میں نماز باجماعت پابندی سے پڑھتے ہوں، ہر خاص و عام کو سلام کرنے میں پیش دستی کرتے ہوں، مصیبت کے وقت صبر کرتے ہوں، سنتوں پر عمل کرتے ہوں، بدعتوں سے دور رہتے ہوں، مسلمانوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہوں اور برائی سے بچاتے ہوں اور مسلمانوں کی قومی اور ملی مصلحتوں کی مذہبی طریق پر پاسداری کرتے ہوں، کیوں کہ علما اور اساتذہ ہی عام مسلمانوں اور طالب علموں کے پیشوا ہیں، اگر ایک عالم اپنے علم سے خود فائدہ نہ اٹھائے تو دوسرے اس سے کیوں کر فائدہ اٹھائیں گے، اس لیے عالم کی گمراہی کا جرم زیادہ سنگین اور پر معصیت ہے، کیوں کہ اس کے ذریعہ سے برائیوں کے پھیلنے کا زیادہ امکان ہے، عوام اس کی معصیت سے جری ہو کر زیادہ جرأت کے ساتھ علانیہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے۔

اسی طرح علما کا فرض ہے کہ وہ کلام پاک کی تلاوت پابندی سے کریں اور دل کو بیدار رکھ کر اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہیں اور تلاوت قرآن میں اس کے معنوں اور

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۱۹۷۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۱۶، یہ اثر کنز العمال ج ۵ ص ۲۰۲ میں موجود ہے۔

مطلبوں، اس کے حکموں اور ممانعتوں اور اس کے وعدوں اور دھمکیوں پر غور وفکر کرتے رہیں۔

اخلاق حسنہ اختیار کرنا: اس کے ساتھ انہیں محاسن اخلاق کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیے، ان کی سراپا زندگی پاکبازی اور قناعت میں بسر ہو، خیرات وصدقات کریں، لوگوں کو کھانا کھلائیں، لوگوں سے کشادہ پیشانی سے پیش آئیں، غصہ کو پی جائیں، دوسروں کی مصیبتوں میں ہمدردی کریں اور ان کے دور کرنے کی کوشش کریں، اپنے اثر واقتدار کو لوگوں کے فائدہ پہونچانے اور ان کی جائز سفارشیں کرنے میں صرف کریں، فقیروں کے ساتھ لطف اور نرمی سے پیش آئیں، پردیسیوں اور رشتہ داروں سے محبت کریں، طالب علموں سے نرمی کا سلوک کریں، ان کی ہر قسم کی دستگیری کریں، اگر کسی کو دیکھیں کہ وہ نماز کا پابند نہیں طہارت کا لحاظ نہیں کرتا یا دوسرے واجبوں کو علانیہ ترک کرتا ہے تو اسے تلطف اور نرمی سے سمجھائیں، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس اعرابی کو جس نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تھا، نرمی سے سمجھایا تھا، مجموعی طور پر اچھے اخلاق اور عمدہ عادتیں توبہ، استغفار، اخلاص ویقین، صبر وتقوی، قناعت ورضا، زہد، توکل، صفائی باطن، حسن ظن، تجاوز، درگذر، حسن خلق، احسان، شکر نعمت، مخلوق پر شفقت، شرم وحیا اور محبت الٰہی ایسے جامع خصائل ہیں، جنہیں پیدا کرنا چاہیے، اور جو صرف حضرت رسول خدا ﷺ کی پیروی واتباع ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں،

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ۔

(آل عمران ع ۴)

اخلاق رذیلہ سے اجتناب: دوسری طرف انہیں ہر قسم کے برے اخلاق سے اپنا دامن پاک اور صاف رکھنا چاہیے، خصوصاً بغض، حسد، کینہ، تکبر، بخل، خباثت نفس، خود پسندی، فخر، غیبت، چغل خوری، جھوٹ، بہتان، حرص، طمع، مداہنت، نمود ونمائش، فحاشی، ہزل گوئی، ٹھٹھا، بیہودہ مذاق اور دنیا طلبی یہ ایسے برے اخلاق ہیں، جن سے علما کو بلند اور برتر رہنا چاہیے، اس کے بعد قاضی ابن الجماعہ فرماتے ہیں:

"بہت سے علمائے زمانہ الا ماشاء اللہ ان عیبوں خصوصاً حسد، تکبر، ریاکاری اور دوسرے لوگوں کو حقیر اور کمتر جاننے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان بلاؤں کی دعائیں زہد اور اخلاق کی کتابوں میں موجود ہیں، جو شخص اپنے آپ کو ان عیبوں سے پاک کرنا چاہے، وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کرے، ان میں سب سے مفید محاسبیؒ (متوفی ۲۴۳ھ) کی کتاب الرعایۃ ہے"۔(۱)

احترام علم: اساتذہ اور علما کا فرض ہے کہ وہ خود بھی علم کی عزت کریں اور اپنے کسی طرز عمل سے کوئی ایسا موقع نہ آنے دیں کہ علم کے احترام کو صدمہ پہونچے، امام اعظم ابوحنیفہ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا:

"اپنے عماموں کی عظمت کرو اور اپنی آستینوں کو وسیع کرو"۔(۲)

امام زہری فرماتے ہیں:

"علم کے لیے یہ بھی کسر شان ہے کہ اسے اس کے حاصل کرنے والے کے گھر پہونچایا جائے، عام اس سے کہ وہ دنیاوی جاہت اور مرتبہ میں وہ جس قدر بھی بلند درجہ ہو"۔

البتہ اگر کوئی خاص مجبوری ہو یا کسی دینی مصلحت کا تقاضا ہو تو تعلیم دینے کے لیے استاذ متعلم کے گھر پر جا سکتا ہے، چنانچہ مختلف ائمہ سلف سلاطین اور امرا کے لڑکوں کو پڑھانے کے لیے ان کے محلوں میں تشریف لے گئے، خود امام زہری خلیفۂ ہشام کے لڑکوں کو پڑھانے کے لیے قصر خلافت میں تشریف لے جاتے تھے، امام شافعی مصر کے جلیل القدر خانوادۂ بنو عبدالحکم کے یہاں مقیم تھے اور ان دونوں بزرگوں کے متعلق یہ تصریح سے معلوم ہے کہ انہوں نے ان لوگوں سے مالی مدد قبول فرمائی، ہشام نے امام زہری کے سات ہزار دینار کا قرض اتارا اور بنو عبدالحکم نے بعض موقعوں پر ۳ ہزار دینار سے امام شافعی کی مدد کی۔

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۴ کتاب الرعایۃ۔ (۲) تعلیم المتعلم ص ۱۷۔

لیکن ان ائمہ کو دینی حیثیت سے جو مرتبہ حاصل تھا اور ان کی پوری زندگی، دین کی خدمت میں جس اخلاص وحسن نیت سے صرف ہوئی، اسے دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیے کہ ان لوگوں کا علم سکھانے کے لیے درباروں میں جانا کسی دنیاوی غرض سے نہ تھا، ورنہ دنیاوی اغراض، جاہ ومنزلت، عزت وشہرت، نام ونمود اور ہمعصروں سے سبقت اور فضیلت حاصل کرنے کی خواہش اسلامی دستور تعلیم کے رو سے بدترین اخلاقی گناہ ہے۔(۱)

امام شافعی فرماتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ مخلوق، علم کا ایک حرف بھی میری طرف منسوب کیے بغیر اس علم کو مجھ سے حاصل کرے''۔

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ:

''مجھے قرآن کا فہم عطا کیا گیا تھا لیکن جب میں ابوجعفر (المنصور) سے تھیلی لے لی تو وہ فہم مجھ سے چھین لیا گیا، ہم اللہ سے اپنی اس مسامحت پر عفو چاہتے ہیں''۔(۲)

چھوٹے پیشوں سے اجتناب: علم کے احترام کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے چھوٹے پیشوں کو اختیار نہ کریں جو اہل علم کے شایان شان نہ ہوں، جیسے حجامت، دباغت صرافہ اور رنگسازی وغیرہ۔

تہمت کے موقعوں سے اجتناب: انہیں تہمت کے مشتبہ موقعوں سے بھی بچنے کی ضرورت ہے، اگرچہ فی نفسہ وہ ان سے دور ہوں اور نہ کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جو اخلاق کے بلند اصولوں کے منافی ہو اور یا جو کام اصل میں برے نہ ہوں مگر لوگ ظاہر میں انہیں برا سمجھتے ہوں، ان سے بھی دامن بچانا چاہیے، ورنہ لوگوں کو ان کے خلاف اپنے دلوں میں

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۶، ۱۷، وتذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۳، ومقدمہ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم ص ۱۴۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۱۹۔

بدگمانی پیدا کرنے کا موقع ملے گا اور وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائیں گے۔

اور اگر ایسے موقعے پر جانے یا کوئی ایسا کام کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کچھ لوگوں کو اس سے مطلع کر دینا چاہیے، تاکہ وہ لوگ اصل حقیقت سے پہلے سے آگاہ رہیں اور بدگمانی پیدا ہونے کی نوبت نہ آئے۔(۱)

مشاغل کی پابندی اور اوقات کی حفاظت: علما و اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ کوشش اور محنت میں ہمیشہ مصروف رہیں اور ان کے عبادت کرنے، پڑھنے پڑھانے، غور و فکر کرنے، تصنیف و تالیف اور بحث و نظر کرنے میں ان کے جو معمولات ہوں، انہیں پابندی سے قائم رکھیں، ان کے سلسلہ کو نہ توڑیں۔

انہیں اپنا وقت سب سے زیادہ عزیز رکھنا چاہیے، مختلف غیر علمی و تعلیمی مشغولیتوں، کھانے پینے، ملنے ملانے، روزی حاصل کرنے، راحت و آرام کرنے اور خانگی زندگی میں وقت گذارنے میں کم سے کم وقت صرف کریں، ربیع بن سلیمان مرادی، امام شافعی کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ:

"میں نے انہیں دن کے وقت کھاتے اور رات کے وقت سوتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ اپنے وقت کا بڑا حصہ تصنیف میں گذارتے تھے"۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کا مرتبہ رسولوں کی جانشینی کے درجہ تک پہونچاتا ہے، یہ بلند مرتبہ تکلیفیں اور مشقتیں اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، صحیح مسلم میں روایت ہے:

"جسم کی آسایش کے ساتھ علم کو تابع نہیں بنایا جاسکتا تھا"۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

"جنت تکلیفوں اور مصیبتوں سے حاصل ہوتی ہے"۔(۲)

مطالعہ کا استمرار: علما اور اساتذہ کو مطالعہ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھنا چاہیے، حضرت سعید بن جبیر

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۹، ۲۰۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۲۶، ۲۷، ۲۸۔

فرماتے ہیں:

"عالم اسی وقت تک عالم رہ سکتا ہے جب تک وہ طالب علم ہے، جب وہ پڑھنا چھوڑ دے اور سمجھے کہ وہ علم سے بے نیاز ہو گیا اور جو کچھ اس نے حاصل کر لیا وہ اس کے لیے کافی ہے، تو ایسا سمجھنے والا سب سے بڑا جاہل ہے"۔(۱)

چھوٹوں سے استفادہ: علما کے لیے تو یہ بھی معیوب نہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں سے استفادہ کریں، علم کی تحصیل خواہ کسی صورت اور شکل میں کسی سے بھی ہو، وہ معیوب نہیں ہے(۲) حکمت مومن کی کھوئی ہوئی دولت ہے اسے جہاں پائے اٹھا لے، ایک دوسری روایت میں ہے، حکمت کا کلمہ جہاں ملے، حاصل کرو، خواہ وہ مشرکوں کے ہاتھوں سے ہو۔(۳)

ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی متوفی ۲۱۹ھ جو امام شافعی کے شاگرد تھے، فرماتے ہیں:

"میں شافعی کی معیت میں مکہ سے مصر تک گیا، راستہ بھر ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے میں ان سے فقہ کے مسئلے پوچھتا اور وہ مجھ سے حدیثیں سنتے تھے"۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

"تم لوگ مجھ سے حدیث زیادہ جانتے ہو، اگر تمہارے پاس کوئی صحیح حدیث نکلے، تو مجھے بتا دیا کرو میں تم سے لے لوں گا"۔(۴)

اشہب بن عبدالعزیز کہتے ہیں:

"میں نے ابوحنیفہ کو مالک کے سامنے ایسا دیکھا جیسے کوئی بچہ اپنے باپ کے سامنے ہو"۔

اس پر امام ذہبی فرماتے ہیں کہ "یہ ابوحنیفہ کے حسن ادب اور تواضع کی بڑی دلیل

(۱) تذکرۃ السامع ص ۲۶ و ۲۸۔ (۲) ایضاً ۲۸۔ (۳) مختصر جامع بیان العلم۔ (۴) تذکرۃ السامع ص ۲۹۔

ہے، حالاں کہ وہ مالک سے تیرہ سال بڑے تھے"۔(۱)

تصنیف وتالیف کا شغل: علما کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ تصنیف اور تالیف میں مشغول رہیں لیکن یہ دشوار گذار راہ اسی وقت اختیار کریں جب اس پر چلنے کی پوری استعداد آ گئی ہو اور اثنائے راہ کی منزل کی دشواریوں سے پوری آگاہی ہو، علوم وفنون کے حقائق بیان کرنے کے لیے تفتیش ومطالعہ، غور وفکر وتدبر اور کتب کے مراجعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اپنی تصنیف کے لیے ایسا موضوع منتخب کریں جس کا نفع عام ہو اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہو، خصوصاً ایسی چیزیں لکھیں جس پر پہلے سے کوئی تصنیف موجود نہ ہو، عبارت میں اعتدال قائم رکھیں، نہ زیادہ طویل ہو اور نہ زیادہ مختصر کہ مفہوم واضح نہ ہو سکے۔

اپنی تصنیف اس وقت تک شائع نہ کریں جب تک اس پر نئے سرے سے نظر ثانی نہ کر ڈالیں اور اس کے مسائل ومباحث اور سیاق وسباق پر کامل غور وخوض نہ کریں۔

اگر تصنیفی استعداد موجود نہ ہو تو ہرگز قلم ہاتھ میں نہ اٹھائیں، کیوں کہ ہر عالم کے لیے مصنف ہونا ضروری نہیں ہے۔(۲)

اساتذہ وطلبہ کے باہمی تعلقات: اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی دور تعلیم میں استادوں اور شاگردوں کے تعلقات خالص روحانی بنیادوں پر قائم تھے، استاد روحانی باپ اور شاگرد ان کے روحانی بیٹے تھے، چنانچہ ان دونوں کے باہمی تعلقات اور مراسم میں سب سے زیادہ یہی رشتہ نمایاں ہے، وہ ان کے اخلاق اور سیرت کے کامل نگہبان تھے، جس موقع پر شفقت ومحبت کی ضرورت ہوتی، شفقت سے پیش آتے، جہاں تنبیہ وتادیب کا موقع ہوتا، تنبیہ کرتے تھے، اشاروں وکنایوں میں نصیحت کارگر ہوتی، تو اشاروں سے کام لیتے اور تصریح سے روکنے کی ضرورت ہوتی، تو صاف گوئی سے کام لے کر روک دیتے، اساتذہ کے سامنے شاگردوں کی آئندہ زندگی کا سوال مستقل طور پر رہتا اور اسی کے مطابق وہ ان کی تعلیم

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۹۵۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۲۹، ۳۰۔

وتربیت کرتے تھے، بلکہ اساتذہ کا دستور سا مقرر ہو گیا تھا کہ ہر طالب علم کو چند وصیتیں اس کے حسب حال لکھ کر اس کے سپرد کرتے تھے، جنہیں شاگرد اپنی آیندہ زندگی میں مشعل راہ بناتے تھے، چنانچہ مختلف ائمہ اسلام کی وصیتیں سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔(۱)

استاذ کی شفقت: استاد شاگردوں کے ساتھ غیر معمولی شفقت، لطف اور محبت سے پیش آتے تھے، ان کے اخلاق وعادات کی نگرانی اور ان میں اسلامی پاکبازی اور پرہیزگاری پیدا کرنے کے علاوہ ان کی ہر قسم کی ضرورتوں پر نگاہ رکھتے تھے، اگر وہ درس کے حلقہ میں خلاف معمول نہ آتے، تو ان کے متعلق دریافت کرتے اور کسی معقول عذر کی صورت میں اسے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی طرح نادار لڑکوں کی پوشیدہ مالی مدد کرتے تھے، وہ بیمار پڑتے تو ان کی عیادت کو جاتے، ان کے گھر میں کوئی سانحہ پیش آتا تو تعزیت کرتے، غرض معاشرتی زندگی میں جس نوعیت کے باہمی مخلصانہ تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے، استاد اور شاگرد کی باہمی معاشرت میں ان کا صحیح نمونہ موجود تھا۔

امام غزالی نے جہاں اساتذہ کو شفقت کرنے کی تلقین کی ہے، اس موقع پر وہ کہتے ہیں کہ معلم کا حق والدین کے حق سے زیادہ ہے اور جس طرح والدین لڑکوں پر شفقت اور مہربانی کرتے ہیں اسی طرح ان کا بھی فرض ہے کہ وہ متعلمین سے شفقت اور مہربانی سے پیش آئیں۔(۲)

قاضی ابن جماعہ استادوں کے لیے لکھتے ہیں:

> ''استاد کو چاہیے کہ طالب علم کی ضرورتوں کا لحاظ رکھے اور اس کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آنے میں، اس پر احسان کرنے اور اگر کبھی اس کی کوئی ایسی زیادتی ہو جو لوگوں سے پیش آجاتی ہے تو اس پر صبر کرنے میں اور بعض وقت اس کی بدتمیزی برداشت کرنے میں، اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہیے

---

(۱) مختصر جامع بیان العلم ص ۶۴ و تعلیم المتعلم۔ (۲) احیاء العلوم جلد ا ص ۳۶

جو عزیز سے عزیز اولاد کے ساتھ کیا جاتا ہے"۔(۱)

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

"اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طالب علموں کی مصلحتوں اور ضروروں کا لحاظ کرنے اور ان میں دل کی یکسوئی پیدا کرنے اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کی مالی مدد کرنے کی کوشش کریں، کیوں کہ جب تک کوئی بندہ اپنے بھائی کی اعانت کرے گا، خدا اس کی اعانت کرے گا اور جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا، خدا اس کی حاجت روائی فرمائے گا اور جو کسی تنگی کے لیے آسانی پیدا کرے گا، خدا قیامت کے دن کا حساب اس پر آسان کرے گا، خاص طور پر علم طلب کرنے میں اعانت کرنا افضل ترین ثواب کا کام ہے"۔

استاذ کو چاہیے کہ اگر کوئی طالب علم حلقہ سے خلاف معمول زیادہ غیر حاضر ہو جائے تو اس کا سبب دریافت کرنا چاہیے اور جو لوگ اسے جانتے ہوں، ان سے اس کے حالات پوچھنے چاہییں اور اگر کسی سے اس کا حال معلوم نہ ہو سکے تو کسی کو اس کے پاس بھیجنا چاہیے، بلکہ اگر وہ خود اس کے گھر جا کر اس کے حالات پوچھے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔(۲)

سلسلۂ تعلیم کے جاری نہ رکھ سکنے کے موانع کو دور کرنا: طالب علموں کی تعلیمی زندگی کے دور میں ایسے موانع پیش آتے ہیں کہ وہ اپنے تعلیمی ذوق کے باوجود مختلف خانگی وجہوں خصوصاً معاشی دقتوں کی وجہ سے اپنی تعلیمی زندگی کے سلسلہ کو توڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اسلامی عہد میں اگر اس قسم کی دقتیں کسی طالب علم کو پیش آتی تھیں، تو اساتذہ ذاتی طور پر اس کی دستگیری کر کے اس کے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھتے تھے، قاضی ابو یوسف اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۴۹، ۵۰۔ (۲) ایضاً ص ۶۱، ۶۲۔

''میں علم حدیث وفقہ کی تحصیل میں مصروف تھا اور میری مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی، ایک دن میرے والد میرے پاس تشریف لائے میں اس وقت ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر تھا، والد کے ارشاد کے مطابق مجلس سے اٹھ کر ان کے ساتھ ہولیا، انہوں نے فرمایا کہ تم ابوحنیفہ کو اپنے لیے نمونہ نہ بناؤ، وہ خوشحال ہیں اور تم معیشت کے لیے محتاج ہو، اس کے بعد میں نے مجبوراً تعلیمی مشاغل میں کمی کردی اور والد کی اطاعت میں روزی کے سامان میں بھی لگا رہنے لگا''۔

ابوحنیفہؒ نے مجھے حلقہ سے غائب پاکر میرے متعلق دریافت فرمایا:

اس واقعہ کے بعد جب میں پہلی مرتبہ پھر ان کے حلقہ میں پہنچا تو انہوں نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی، میں نے اصل واقعہ بیان کردیا، اس کے بعد جب لوگ حلقہ سے اٹھ کر چلے گئے تو انہوں نے ایک تھیلی میری طرف بڑھائی اور فرمایا کہ اس سے کام نکالو اور حلقہ سے غیر حاضر مت ہو، جب یہ رقم خرچ ہوجائے تو مجھے بتا دینا چنانچہ اس کے بعد میں پابندی سے حلقہ میں شریک ہونے لگا، اس تھیلی میں سو درہم تھے، پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد انہوں نے سو درہم کی ایک اور تھیلی عنایت فرمائی''۔(۱)

طلبہ کی پوشیدہ مالی امداد: اساتذہ بوقت ضرورت طالب علموں کی پوشیدہ مالی مدد کرتے تھے، امام ابوحنیفہ کا واقعہ اوپر گذرا، ابوزکریا تبریزی کا بیان ہے کہ ''وہ علامہ خطیب بغدادی سے ان کے درس کے حلقہ (جامع دمشق) میں علم ادب کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کا اسی جامع کے منارہ کے اوپر کے حجرے میں قیام تھا، ایک مرتبہ ناگاہ شیخ خطیب بغدادی اوپر کی منزل میں تشریف لے گئے اور اپنے عزیز شاگرد سے کہا'' آج جی چاہا کہ تم سے مل لوں'' اس کے بعد ایک گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے، چلنے کے وقت انہوں نے ایک ورق

(۱) وفیات الاعیان جلد۲ ص ۴۰۱۔

میری طرف بڑھا کر کہا کہ "یہ مسنون ہدیہ ہے، ان سے چند قلم خرید لینا" یہ کہہ کر وہ تشریف لے گئے، اس میں پانچ دینار تھے، پھر اس کے بعد دوسری مرتبہ آئے اور اتنی ہی رقم رکھ کر چلے گئے۔(۱)

قاضی اسد بن فرات امام محمد کی شفقتوں کے سلسلہ میں کہتے ہیں:

"میں ایک دن محمد بن حسن کے حلقۂ درس میں بیٹھا تھا، ناگاہ سبیل لگانے والے کی آواز آئی میں جلدی سے اٹھ کر گیا اور پانی پی کر حلقہ میں واپس چلا آیا، اس پر محمد نے مجھ سے پوچھا مغربی! تم سبیل کا پانی پیتے ہو؟ میں نے عرض کیا "خدا آپ کو فلاح دے، میں تو ابن سبیل ہوں" درس ختم کر کے میں گھر چلا گیا، رات کے وقت کسی نے دروازہ پر آواز دی، دروازہ کھولا تو معلوم ہوا امام محمد کا خادم ہے، اس نے مجھ سے کہا، آقا نے آپ کو سلام کہا ہے اور آپ سے کہا ہے کہ مجھے آج سے پہلے بالکل معلوم نہ تھا کہ تم "ابن سبیل" ہو، اس لیے اس نفقہ کو لے لو اور اپنی ضرورتیں پوری کرو"۔

اس کے بعد اس نے ایک بھاری تھیلی میری طرف بڑھائی، میں دل میں خوش ہوا کہ اس میں درہموں کی بڑی تعداد ہے، جب میں نے آ کر تھیلی کھولی تو دیکھتا ہوں کہ اس میں اسی اشرفیاں بھری ہوئی ہیں۔(۲)

طلبہ کی عیادت، تعزیت اور غم گساری: اگر کوئی طالب علم بیمار پڑتا یا کسی غم میں مبتلا ہوتا تھا، تو استاذ اس کے مکان پر جا کر اس کی عیادت کرتا اور اس مصیبت میں ہمدردی کر کے تعزیت کا فرض ادا کرتا تھا اور اس موقع پر اسے کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو امداد کرتا تھا، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

"اگر طالب علم بیمار پڑے، تو استاذ کو اس کی عیادت میں جانا چاہیے اور اگر وہ کسی غم میں مبتلا ہو تو اس کا غم ہلکا کرنا چاہیے"۔(۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۱۵۔ (۲) معالم الایمان ابن ناجی۔ (۳) تذکرۃ السامع ص ۶۲، ۶۳۔

اسلامی عہد میں اساتذہ طالب علموں کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا کرتے تھے، چنانچہ شیخ ابووداعہ کا بیان ہے کہ وہ حضرت سعید بن میتب کے حلقۂ درس کے طالب علم تھے، شیخ نے ان کی ایک مصیبت کے وقت جیسی ہمدردی اور غمگساری کی، اس کی مثال کم نظر آئے گی، ابووداعہ کا بیان ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سانحۂ وفات کی وجہ سے چند دنوں کے لیے حضرت سعید بن میتب کے حلقۂ درس میں شریک نہ سکے، اس کے بعد جب وہ حلقہ میں حاضر ہوئے اور شیخ نے غیر حاضری کا سبب پوچھا اور انہوں نے بیوی کے انتقال کی خبر سنائی تو شیخ کو ملال ہوا اور فرمایا کہ تم نے مجھے اطلاع نہ دی کہ میں جنازہ میں شریک ہوسکتا۔

اس کے بعد حضرت سعید بن میتب نے ان سے ان کی دوسری شادی کے متعلق دریافت کیا، انہوں نے افسوس کے ساتھ اپنی ناداری بیان کی، کہ ان کے پاس مہر ادا کرنے کے لیے دو تین درہم سے زیادہ رقم موجود نہیں، حضرت سعید نے پوچھا کہ اگر وہ سامان کردیں تو نکاح کرسکتے ہیں؟ ابووداعہ نے اثبات میں جواب دیا، یہ سنتے ہی حضرت سعید نے اسی مجلس میں صرف دو یا تین درہم پر اپنی صاحبزادی کو ابووداعہ کی زوجیت میں دے دیا۔

ابووداعہ حلقہ سے اٹھنے کے بعد گھر آئے، اس دن روزہ سے تھے، شام کو افطار کرکے گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، ابووداعہ نے نام پوچھا تو باہر سے جواب آیا کہ ''میں سعید ہوں'' ابووداعہ کو تعجب ہوا کہ اس نام کے کئی بزرگ شہر میں موجود ہیں سعید بن میتب ہو نہیں سکتے کہ وہ چالیس سال سے سوائے اپنے گھر سے مسجد جانے کے کہیں اور جاتے دکھائی نہیں دیے، اسی خیال میں انہوں نے دروازہ کھولا، دیکھتے ہیں کہ ان کے استاذ سعید بن میتب ہی سامنے موجود ہیں، ابووداعہ نے شرم کے ساتھ معذرت کی کہ انہوں نے خود کیوں تکلیف کی، کسی کے ذریعہ طلب فرمالیا ہوتا، حضر سعید بن میتب نے فرمایا کہ:

''میں اس لیے چلا آیا کہ آج تمہارا نکاح ہوا ہے، یہ اچھا معلوم نہیں ہوا کہ تم

اپنے گھر میں تمہارات گذارو، یہ میرے ساتھ تمہاری بیوی موجود ہیں''۔

یہ کہہ کر اپنی صاحبزادی کو دروازہ کے اندر کر دیا، ابو وداعہ کہتے ہیں کہ حضرت سعید کی یہ صاحبزادی وہی تھیں، جن سے خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے ولی عہد ولید کے لیے پیغام بھیجا تھا اور حضرت سعید نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ خود بھی عالمہ، فاضلہ، محدثہ اور حافظ قرآن تھیں۔(۱)

مذاکرہ ومناظرہ: اساتذہ علوم کے تازہ رکھنے کے لیے باہمی مذاکرہ کرتے تھے، نیز مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کر کے ان کے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کرتے تھے، اسلامی عہد میں ان مذاکروں کا بڑا رواج تھا، ان ہی سے مناظروں کی ابتدا ہوئی، ان مذاکروں اور مناظروں میں بہت سے مسئلے معلوم ہو جاتے تھے، اس لیے ان میں وہ بڑی توجہ اور انہماک سے وقت صرف کرتے تھے، علی بن حسن بن شقیق کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ اور ابن مبارک مسجد سے عشا کی نماز پڑھ کر مکان جانے کے لیے اٹھے، سردیوں کا زمانہ تھا، تیز سردی پڑ رہی تھی، ابن مبارک نے چلتے وقت ابن شقیق سے مسجد کے دروازہ کے پاس کسی حدیث کا تذکرہ کیا، انہوں نے جواب میں کوئی بات کہی اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہو گیا، اس وقت سے وہ دونوں مسجد کے دروازہ پر اسی طرح ٹھنڈی رات میں شبنم میں کھڑے گفتگو کرتے رہے، یہاں تک کہ مؤذن آیا اور اس نے صبح کی اذان دی اس وقت انہیں اس قدر دیر ہو جانے کی خبر ہوئی۔(۲)

جب اہل علم کسی دوسرے شہر سے آتے تھے، تو وہاں کے احباب اس شہر کے علمی تحفہ کو بڑے اصرار سے اپنے رفیق سے طلب کرتے تھے، ابوعلی نیشاپوری کا بیان ہے کہ وہ بغداد آئے، یہاں مختلف اہل علم ابواحمد غسال، ابواسحاق بن حمزہ، ابوطالب بن نصر اور ابوبکر جعالی جمع ہوئے اور ابوعلی سے ایک مجلس میں نیشاپور کی حدیثوں کی روایتیں سنانے کے لیے

(۱) وفیات الاعیان جلد ا ص ۲۵۹۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۲۵۵۔

کہا گیا، انہوں نے پہلے تامل کیا لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو انہوں نے اس مجلس میں تیں حدیثیں روایت کیں جن میں ایک حدیث کے سوا کوئی ایسی نہ تھی جو ان میں سے کسی کے پاس پہلے سے موجود ہو، البتہ ابوحمزہ نے صرف ایک حدیث کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیا۔(۱)

علما کی شرکت، اساتذہ کے حلقوں میں: اس زمانہ میں علما کو اس کی عام اجازت تھی کہ اپنے معاصرین کے درس و تعلیم کے حلقوں میں شریک ہوں اور درس کے درمیان میں استاذ کی تقریر پر ٹوکیں اور سوال و جواب سے مسئلوں کی چھان بین کریں، ایسے مواقع دراصل بڑے نازک ہوتے تھے، طالب علموں کی بھری محفل میں استاذ کی خفت کا سامان ہوتا تھا، اساتذہ اپنے خطبوں پر خود اس قدر تیار ہو کر آتے تھے کہ وہ بڑے سے بڑے فاضلِ اجل کے درس کے حلقے میں آجانے پر بھی مرعوب نہ ہوتے تھے اور سوالوں کے تشفی بخش جوابات دیتے تھے۔

البتہ سیرت کی کتابوں میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ کبھی کبھی بعض مناظرہ پسند طبائع درس کے حلقہ میں استاذوں پر ناروا حملے کرتے اور طعن وطنز سے محفلوں کو مکدر کر دیتے، اساتذہ بھی ایسے لوگوں کی طبیعتوں اور عادتوں سے واقف ہو گئے تھے، جب کوئی ایسا موقع آتا تو بڑی خوش اسلوبی سے نباہ لیتے تھے، سیوطی نے محمد بن منصور سمعانی کے حلقۂ درس کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے حلقۂ درس میں ایک مغربی اہل علم شریک ہوئے جو کسی قدر تیز اور مناظرہ پسند واقع ہوئے تھے اور اہل علم میں ان کے مناظروں کی شہرت ہو چکی تھی، ان کے ایک اعتراض کے جواب میں سمعانی نے شاگردوں سے کہا:

"جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسے لکھ لو، آپ اس سے زیادہ واقف ہیں"۔

شاگردوں نے بلا تامل تصحیح کر لی یہ طرز عمل دیکھ کر تھوڑی دیر کے بعد نو وارد اہل علم نے پھر کہا:

"میرے آقا مجھ سے خطا ہوئی صحیح وہی ہے جو آپ نے املا کرایا تھا"۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۱۱۔

سمعانی نے پھر دوبارہ تصحیح کرادی، اس کے بعد جب وہ مجلس سے چلے گئے تو سمعانی نے شاگردوں سے کہا:

> ''یہ حضرت سمجھتے تھے کہ میں بھی ان سے دوسروں کی طرح الجھ پڑوں گا اور میرے ساتھ بھی یہ ایسی ہی تیز زبانی سے پیش آئیں گے جیسے دوسروں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، اسی لیے میں خاموش ہو گیا اور بالآخر وہ خود رجوع کرنے پر مجبور ہوئے''۔(۱)

مجالس مناظرہ: ان مذاکروں سے اس زمانہ میں مناظروں کا عام رواج ہو گیا تھا جن میں استاد اور شاگرد دونوں شریک ہوتے اور مختلف علوم حدیث، فقہ، کلام اور ادب پر مناظرے کی علاحدہ علاحدہ مجلسیں منعقد ہوتیں، اہل علم سلاطین و امرا کے درباروں میں یہ مجلسیں زیادہ گرم ہوتی تھیں، ملک شاہ کے دربار کے وہ مناظرے یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں، جو امام غزالی اور دوسرے علمائے زمانہ سے ہوئے تھے، ان مناظروں میں اگرچہ کبھی کبھی طرفین حق سے ہٹ کر مناظرانہ ردوکد میں مبتلا ہو جاتے تھے لیکن عموماً اس زمانہ میں صحیح علمی مذاق اور حق کو حق سمجھ کر قبول کرنے اور باطل کے باطل ٹھہرنے پر اس سے رجوع کر لینے کی خوبیاں موجود تھیں، اس لیے مناظروں کی ان مجلسوں سے علما اور طالب علموں دونوں کو فائدے حاصل ہوتے اور دقیق علمی حقائق آشکارا ہوتے تھے۔

پانچویں صدی تک مناظروں کی مجلسوں میں جو بے عنوانیاں پیدا ہو چکی تھیں اور ردوکد کے مناظروں سے جو برائیاں پیدا ہوتی تھیں، انہیں امام غزالی نے احیاء العلوم میں بیان کیا ہے اور ان سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے، بلکہ وہ ایسی مناظرانہ مجلسوں کے سرے سے مخالف تھے(۲) کیوں کہ وہ خود تلخ تجربے اٹھا چکے تھے۔

---

(۱)بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص۹۰۔(۲)احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم۔

(۴)

طلبہ کے فرائض

اسلامی مدرسوں کے طالب علموں کے ذمہ جو فرائض تھے، ان کا اندازہ قاضی ابن جماعہ کی ان تلقینوں سے ہوتا ہے جو انہوں نے ایک مستقل باب میں طالب علموں کے لیے مختلف فصلوں طالب علم کے آداب اپنی ذات کے متعلق طالب علم کے آداب اپنے استاذ کے ساتھ طالب علموں کے درسوں کے آداب، درس کے حلقہ میں پڑھنا اور حلقہ میں استاذ اور شاگرد کے ساتھ اس کا برتاؤ، پھر محشی نے تاریخ اور سیرت کی کتابوں سے جابجا مثالیں دی ہیں، طلبہ کے یہ آئین وآداب چار قسموں میں کیے جاسکتے ہیں، ایک تو طالب علموں کے فرائض اپنی ذات کے متعلق، دوسرے استاذوں اور شاگردوں کے باہمی معاشرتی اور تعلیمی تعلقات اور تیسرے طالب علموں کے واجبات دارالاقامہ میں اور چوتھے طلبہ کی ذمہ داریاں ان کے حلقۂ درس میں، ان میں سے تیسری قسم یعنی دارالاقامہ میں طلبہ کے فرائض کی تفصیل اوپر گذر چکی، حلقۂ درس میں ان کے جو واجبات ہیں، ان کا بیان آگے آئے گا، بقیہ اول الذکر دونوں قسموں کے فرائض اجمالاً ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔(۱)

طلبہ کے ذمہ خود ان کی ذات کے متعلق جو فرض عائد تھے، ان کی بھی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں، ایک خود ان کی شخصی اخلاقی تعلیم وتربیت اور دوسرے ان کے تعلیمی فرائض۔

دل کی پاکی اور نیت کا اخلاص: طلبہ کی سیرت کے نشوونما کے لیے پہلی شرط یہ تھی کہ ان

(۱) تذکرۃ السامع ص ۶۷۔

کے دل اور دماغ معصومانہ طور پر پاک اور صاف رہیں، برے اخلاق اور اوصاف سے دامن بچائیں، دل کی پاکی کے ساتھ ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز پورے حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ ہوا ہو اور اسلام نے جو تعلیمی نصب العین مقرر کیا ہے، وہ ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے ہو۔(۱)

علم کے لیے سفر: اس زمانہ میں ہر طالب علم کا فرض تھا کہ وہ علم کی طلب کے لیے کوئی نہ کوئی سفر ضرور کرے، علم حاصل کرنے کے لیے سفر کرنے کی ابتدا صحابہ کے زمانہ ہی میں ہوئی تھی، جیسا کہ پہلے گذر چکا، صحابہ ایک ایک حدیث کی تصدیق کے لیے حجاز سے شام اور شام سے مصر کا سفر کرتے تھے، پھر تابعین نے ان ہی کے طریقہ کی پیروی کی، بشر بن عبداللہ حضرمی کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک حدیث کے لیے شہر بہ شہر پھرتے رہے ہیں، حضرت سعید بن مسیب نے بھی صرف ایک حدیث کے لیے کئی دن اور رات کا سفر کیا(۲) طلبہ بلاتکلف مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب صرف علم کی طلب میں جایا کرتے تھے، مقری صاحب نفح الطیب، ابن ناجی صاحب معالم الایمان اور صاحب ریاض النفوس وغیرہ نے ایسے طالب علموں کا حال اپنی کتاب میں مستقل باب قائم کر کے لکھا ہے جو علم کی تحصیل میں اسپین اور افریقہ سے شام، حجاز، عراق اور مصر گئے اور پھر ان مقاموں سے افریقہ اور اسپین میں داخل ہوئے۔

یہ علمی سفر طلبہ عموماً پیدل طے کرتے تھے اور ان سفروں میں سینکڑوں میل چل لیتے تھے، مثال کے طور پر ابو حاتم رازی کو پیش کیا جا سکتا ہے، وہ کہتے ہیں:

> ''میں نے سفر میں پہلے سات برس قیام کیا اور ایک ہزار فرسخ سے زیادہ چلا، پھر میں نے فرسخ کو شمار کرنا چھوڑ دیا اور بحرین سے مصر تک پیدل چلا، پھر وہاں سے رملہ پیدل آیا اور اس کے بعد پیدل ہی طرطوس پہنچا، اس سفر میں میرے

---

(۱) احیاء العلوم ج ۱ص ۳۲ و تذکرۃ السامع۔ (۲) جامع بیان العلم ص ۴۶، ۴۷۔

بیس سال پورے ہوگئے''۔(۱)

حافظ ابویوسف یعقوب بن سفیان فسوی نے تیس سال سفر میں گذار دیے۔(۲)

حضرت ابوعبدالرحمٰن بقی بن مخلد قرطبی نے دوسواسی شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا لیکن اس کے باوجود ان کا بیان ہے کہ انہوں نے ہر استاذ سے پیدل چل کر حدیث سنی ہے، یہ اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں کے تھے۔(۳)

امام بخاری نے سولہ سال کی عمر میں اپنے شہر کی حدیثیں سننے کے بعد علم کی طلب کے لیے سفر شروع کیا، باپ کا سایہ موجود نہ تھا، ضعیف ماں اور بہن اس طالب علم کی نگہداشت کے لیے اس کے ساتھ ہوگئیں اور مختلف شہروں بلخ، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، عسقلان، دمشق اور مصر وغیرہ میں پہنچ کر وہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا۔(۴)

امام دارمی نے حرمین، خراسان، شام، عراق اور مصر جا کر علم کی تحصیل کی۔(۵)

اس زمانہ میں طالب علم، علم کی طلب کے لیے سفر کرنے کا دلی شوق رکھتے تھے، حافظ ابوبکر بن ابراہیم اسماعیلی اپنی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ:

> ''جب محمد بن ایوب رازی کی وفات کی خبر پہنچی تو میں رونے اور چیخنے لگا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر پر خاک ڈالنے لگا، یہ دیکھ کر میرے گھر کے لوگ جمع ہوگئے اور اس مصیبت کا حال پوچھا، میں نے کہا کہ محمد بن ایوب آخر وفات پاگئے اور تم لوگوں نے مجھے ان کے یہاں تک پہنچنے سے باز رکھا، یہ سن کر لوگوں نے مجھے تسلی دی اور مجھے طلب علم کے لیے نکلنے کی اجازت دی اور میرے ماموں کو میرے ساتھ کر دیا اور میں شہر نساء حضرت حسن بن سفیان کی خدمت میں روانہ ہوگیا، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب یہاں (اپنے چہرے

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد۲ص ۱۴۶۔ (۲) ایضاً ص ۱۶۰۔ (۳) ایضاً ص ۲۰۴، ۲۰۵۔ (۴) ایضاً ص ۱۳۴۔

(۵) ایضاً ۱۱۵۔

کی طرف اشارہ کر کے) ایک بال بھی نہ تھا"۔(۱)

حافظ ابوعلی حسن بن صاحب ابن حمید شاشی متوفی ۳۱۴ھ خراسان کے شیوخ سے حدیث لکھنے کے بعد عراق، شام اور مصر کا سفر کیا(۲) حافظ محمد بن ابراہیم بن حیون اندلسی متوفی ۳۰۵ھ نے اندلس کے شیوخ سے پڑھنے کے بعد عراق، حجاز اور یمن آ کر علم کی تحصیل کی(۳) حافظ ابوبکر محمد بن ابراہیم معروف با بن مقری نے تحصیل علم میں اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، بیروت، عکا، رملہ، آذنہ، واسط، عسکر، حمص، رقہ اور مصر کی خاک چھانی، وہ کہتے ہیں "میں نے مشرق ومغرب کا چار مرتبہ طواف کیا.....اور میں نے ابن فضالہ کے ایک نسخہ کی خاطر ستر مرحلے طے کیے اور وہ نسخہ اگر نان بائی کو دیا جاتا تو اس کے بدلہ میں وہ ایک روٹی بھی نہ دیتا......میں صرف بیت المقدس دس مرتبہ گیا ہوں(۴) حافظ ابن مفرج ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی شہر قرطبہ میں تحصیل علم کرنے کے بعد مزید تحصیل کے لیے روانہ ہوئے اور طرابلس، مصر، دمشق، جدہ، صنعاء، زبید اور بیت المقدس پہنچ کر حدیث کی تحصیل کی(۵) حافظ ابوالعباس احمد بن محمد رازی متوفی ۳۹۳ھ پیدائشی نابینا تھے، تاہم انہوں نے تحصیل علم کے شوق میں بخارا، نیشاپور، بغداد اور بلخ کا سفر کیا اور یہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا(۶) حافظ ولید بن بکر بن مخلد سرقسطی اندلس کے دور دراز مقام سے خراسان تک آئے اور تحصیل علم میں مصروف رہے اور دینور (ایران) میں ۳۹۲ھ میں وفات پائی(۷) حافظ ابوزکریا عبدالرحیم بن احمد تمیمی بخاری متوفی ۴۶۱ھ بخارا میں حدیث سننے کے بعد خراسان، شام، یمن، مصر اور افریقہ کا سفر کیا(۸) حافظ محمد بن طاہر مقدسی بیت المقدس کے شیوخ حدیث سے پڑھنے کے بعد اس عہد میں جہاں علم کی خوشبو سونگھی، پاپیادہ دوڑے گئے، چنانچہ مشہور مقامات بغداد، مکہ، تنس،

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۶۱۔ (۲) ایضاً ص ۳۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۵۔ (۴) ایضاً ص ۱۸۲، ۱۸۳۔

(۵) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۱۴۔ (۶) ایضاً ص ۲۳۲، ۲۳۳۔ (۷) ایضاً ص ۲۴۰، ۲۸۱۔ (۸) ایضاً ۳۵۱۔

دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہرات، جرجان، آمد، استراباد، بوشنج، بصرہ، دینور، رے، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، حرمین، نہاوند، ہمدان، واسط، اہواز اور بسطام وغیرہ میں انہوں نے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا اور جہاں گئے وہاں نہ صرف پاپیادہ گئے بلکہ کتابوں کا پشتارا بھی پیٹھ پر لادے رہتے، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ ۲۰ فرسخ (۶۰ میل) پیدل چل لینے پر قادر تھے (۱) ایک مرتبہ حافظ ابوعبداللہ محمد بن عبدالواحد اصفہانی جن شہروں تک طلب علم میں پہنچے تھے، ایک مرتبہ ان کے نام گنانے لگے تو ایک سو بیس مقامات نکلے۔ (۲)

امام شعبی فرماتے ہیں:

''اگر کسی شخص نے شام کے اس سرے سے یمن کے اس سرے تک صرف اس لیے سفر کیا کہ وہ حکمت کا ایک کلمہ سن لے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنا سفر ضائع نہیں کیا''۔ (۳)

پھر خود فرماتے ہیں ''میں صرف ایک حدیث کی طلب میں رات رات اور دن دن بھر چلا ہوں''۔ (۴)

اس علمی سفر سے طالب علموں کو بڑا فائدہ یہ پہنچتا تھا، جیسا کہ ابن خلدون نے یہ تشریح لکھا ہے کہ تھوڑے زمانہ میں مختلف ملکوں کی سیاحت اور مختلف ملکوں اور شہروں کے علما کی زیارت سے ان میں علمی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی، وہ لکھتا ہے:

''علم کی تحصیل کے لیے سفر کرنے اور مشائخ سے ملنے میں تعلیم میں کمال کا اضافہ ہوتا ہے، کیوں کہ انسان علم، اخلاق مذہب اور دوسری فضیلتوں کو کبھی تو تعلیم و تعلم کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے اور کبھی نقل، تقلید اور میل جول سے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد۴ ص ۳۹ تا ۴۱۔ (۲) ایضاً ص ۵۳۔ (۳) مختصر کتاب العلم ص ۴۷۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۴۸۔

لیکن جو ملکہ میل جول سے حاصل ہوتا ہے، وہ زیادہ قوی اور مستحکم ہوتا ہے"۔

"طالب علم پر تعلیمی اصطلاحیں بھی مشتبہ ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض طالب علم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ علم کا جز ہیں، یہ شبہہ علما کے میل جول کے بغیر زائل نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اساتذہ کے تعلیمی طریقے مختلف ہوتے ہیں"۔

"اس لیے متعدد مشائخ سے ملنے سے وہ ان مختلف طریقوں کو نفس علم سے الگ کر لے گا اور سمجھنے لگے گا، کہ یہ صرف تعلیمی طریقے ہیں، خود علم ان سے علاحدہ چیز ہے، یہ اس کے لیے ہے جس کے لیے اللہ علم اور ہدایت کے راستے آسان بنا دے، اس لیے علم کی طلب میں فائدے حاصل کرنے، مشائخ اور عام لوگوں سے مل جل کر کمال پیدا کرنے کے لیے سفر کرنا ضروری ہے"۔(۱)

اس کے علاوہ علمی اور تعلیمی سفروں سے طالب علموں کو دوسرا فائدہ یہ پہنچتا تھا، کہ وہ گھر بار سے علاحدہ ہو کر پورے سکون اور اطمینان سے علم کی تحصیل میں مصروف رہتے تھے، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں کو اسی لحاظ سے سفر کرنے کا مشورہ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اور اسی لیے سلف علم کی طلب میں وطن سے بے وطن ہونا، خاندان، عزیز، اقارب اور گھر بار کو چھوڑنا پسند کرتے تھے، اگر گھر بار کی فکر پڑھنے کے زمانہ میں طالب علم کے دل و دماغ پر چھائی رہی، تو اس کا دل علمی حقائق پر متوجہ نہ ہو سکے گا، کیوں کہ اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے ہیں"۔(۲)

دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی: پھر طالب علم کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا، کہ وہ دنیا و مافیہا ہر چیز سے بے تعلق ہو جائے، تاکہ اس کو دماغی سکون اور ذہنی یکسوئی حاصل ہو، مثل مشہور ہے کہ:

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون، ص ۶۲۰۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۷۰، ۷۱۔

العلم لا يعطيك بعضه حتى تعطيه كله.	علم تمہیں اپنا بعض حصہ بھی نہ دیگا جب تک تم اسے اپنا سب کچھ نہ دے دو۔

خطیب نے کسی دوسرے بزرگ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"اس علم کو وہی شخص پا سکتا ہے جو اپنی دکان بٹھا دے، اپنا باغ خراب کر دے، اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ دے اور اگر اس کا کوئی عزیز قریب بھی مرے، تو اس کے جنازے میں نہ جائے"۔

حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ علم کی تحصیل کے لیے دلی تشریف لے گئے، تو والدین اور عزیز و اقارب کے جو خطوط آتے، انہیں اس خیال سے نہ پڑھتے کہ شاید کوئی بری خبر درج ہو اور طبیعت علم کی تحصیل کی طرف سے اچاٹ ہو جائے۔(۱)

امام شافعی فرماتے ہیں:

"اگر مجھے ایک پیاز بھی خریدنے کی زحمت اٹھانی پڑتی تو میری سمجھ میں کوئی علمی مسئلہ نہ آتا"۔

بعض شیوخ اپنے شاگردوں کے کپڑے صرف اس لیے رنگوا دیتے تھے کہ ان کے بار بار دھونے کی فکر جاتی رہے، جس کی وجہ سے علمی مصروفیت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

اصل مدعا یہ ہے کہ طالب علم کے لیے پوری طرح دلی اطمینان اور ذہنی یکسوئی حاصل رہے، تا کہ اس کی تعلیمی مصروفیتوں میں خلل نہ پڑے۔(۲)

تجرد: اس ذہنی یکسوئی اور دلی سکون کے لیے طالب علموں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، خطیب بغدادی کہتے ہیں:

"طالب علم کے لیے بہتر ہے کہ وہ کنوارا رہے، تا کہ زوجیت کے حقوق اور

(۱) نزہۃ الخواطر، ص ۹۔ (۲) احیاء العلوم جلد ۱، ص ۴۲ و تذکرۃ السامع ص ۷۰، ۷۱ و تعلیم المتعلم ص ۵۰۔

معیشت کی طلب کی مشغولتیں اسے کمال کی طلب سے محروم نہ کردیں"۔

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:

"جس نے شادی کرلی، وہ سمندر میں کشتی پر سوار ہوگیا اور اگر کوئی بچہ پیدا ہو گیا تو اس کشتی میں سوراخ بھی ہوگیا"۔

اس کے بعد قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

"جو شخص شادی کرنے پر مجبور نہ ہو، اس کا شادی نہ کرنا بہتر ہے، خصوصاً طالب علم کے لیے جس کی ساری پونجی دل کے اطمینان اور بے فکری کی زندگی میں رکھی ہے"۔(۱)

فقر و فاقہ اور صبر و قناعت: طالب علموں کے لیے قناعت پسندی ان کا بہترین جوہر تصور کی جاتی تھی، انہیں معمولی غذا اور سادہ اور مختصر لباس میں بسر کرنے اور اگر فقر و فاقہ کی نوبت آئے تو صبر و استقلال سے اسے برداشت کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔

امام شافعی فرماتے ہیں:

"کوئی شخص اس علم کو ملک و دولت، عزت اور خودداری قائم رکھ کر حاصل نہیں کرسکتا، بلکہ جو شخص اپنی خودی مٹا کر اور تنگ حالی میں گذار کر علما کی خدمت کی سعادت حاصل کرے گا، وہ کامیاب ہوگا، بلکہ یوں سمجھو علم کی طلب صرف نادار اور مفلس ہی کے لیے سازگار ہوسکتی ہے"۔

امام مالک فرماتے ہیں:

"کوئی شخص علم و دانش کے مرتبہ پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس پر فقر اور فاقہ کی مار نہ پڑے اور اسے وہ ہر چیز پر ترجیح نہ دے لے۔

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۷۲۔

"یہ امر (علم) اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا، جب تک فقر و فاقہ کا مزانہ چکھ لیا جائے"۔(۱)

چنانچہ ائمۂ اسلام کے سوانح میں بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ انہوں نے تکلیف اور تنگدستی میں بسر کیا اور صبر اور استقلال سے اپنی تعلیم جاری رکھی، ابن القاسم، حضرت ربیعہ بن سلمان کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ:

"ربیعہ علم کی طلب میں ناداری کی اس حد تک پہنچ گئے تھے، کہ انہوں نے اپنے مکان کی چھت کی لکڑی فروخت کر ڈالی اور یہاں تک کہ وہ آبادی کے گھوروں پر سے منقیٰ اور کھجور کا فشردہ اٹھا کر کھاتے تھے"۔(۲)

حافظ ابو محمد حجاج کی تحصیل علم کے زمانہ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ حافظ شبابہ کے یہاں درس حدیث کے لیے گئے تو ان کی ماں نے انہیں سو کلچے پکا کر تھیلی میں دے دیئے، وہ روزانہ ایک کلچہ نکالتے اور دجلہ کے پانی میں بھگو کر سد رمق کرتے جب کلچے ختم ہو گئے، تو انہیں بھی استاد کا در چھوڑنا پڑا۔(۳)

حضرت بقی بن مخلد نے چقندر کے پتے کھا کر طالب علمی کا زمانہ کاٹا۔(۴)

حضرت ابو حاتم رازی نے طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ کپڑے بیچ کر گذارا کیا اور جب کپڑے بھی نہ رہے تو دو دن فاقے کے گذر گئے۔(۵)

ابو نصر فارابی کو طالب علمی کے زمانہ میں چراغ کا تیل میسر نہ تھا، چوکیداروں کے چراغ کے پاس بیٹھ کر پڑھتا تھا(۶) اور ابو العلا ہمدانی مسجد کے چراغ کی روشنی میں پڑھتے تھے۔(۷)

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۷۱، ۷۲ مختصر جامع بیان العلم ص ۴۹، ۵۰ و تذکرۃ السامع۔ (۲) مختصر جامع بیان العلم ص ۴۸۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۳۰۔ (۴) ایضاً ص ۲۰۴۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۴۷۔

(۶) عیون الانباء جلد ۲ ص ۱۳۴۔ (۷) تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۱۲۰۔

مدرسہ نظامیہ بغداد کے علامہ وخشی کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''میں عسقلان میں تھا اور ابن مصحح وغیرہ سے حدیث سنتا تھا، میرے اخراجات میں تنگی ہوگئی اور چند دن فاقے سے گذر گئے، ان ہی دنوں میں کچھ لکھنے بیٹھا، مگر بھوک کے غلبہ کی وجہ سے لکھ نہ سکا، تو ایک نان بائی کی دکان کی طرف چلا گیا اور اس کے قریب بیٹھا، تا کہ روٹی کی خوشبو سونگھ کر کچھ تقویت حاصل کروں، اس کے بعد اللہ نے مجھ پر اپنی روزی کا دروازہ کھول دیا''۔(۱)

امام شعبی سے پوچھا گیا کہ انہیں علم کیوں کر حاصل ہوا، تو فرمایا:

''اپنے اوپر اعتماد نہ کرنے، علم کے لیے سفر کرنے، گدھوں کی طرح صبر کرنے اور کوے کی طرح صبح تڑکے اٹھنے سے''۔(۲)

کم خوری: طالب علموں کو کھانا کم کھانے کی ہدایت کی جاتی تھی، کیوں کہ اس سے طبیعت ہلکی رہتی ہے اور مطالعہ دیکھنے اور سبق یاد کرنے میں آسانی ہوتی ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ:

''میں نے سولہ برس تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا''۔

حضرت حسن سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''غور وفکر نصف عبادت ہے اور کم خوری عین عبادت''۔

حضرت سہل تستری مبالغہ کے ساتھ کہتے ہیں:

''میں قیامت کے دن کھانا چھوڑنے سے بہتر نیکی کا کوئی دوسرا کام نہیں جانتا''۔

پھر فرمایا:

''علم اور حکمت گرسنگی میں رکھے گئے ہیں اور جہل اور عصبیت پرخوری میں''۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۴۵۔ (۲) ایضاً جلد ۱ ص ۷۱۔

نضر بن شمیل کہتے ہیں:

"کوئی شخص علم سے اس وقت تک لذت نہیں پا سکتا، جب تک وہ بھوکا نہ ہو اور علم کی محویت میں وہ بھوک کو بھول نہ جائے"۔

رزق حلال اور نوعیت غذا: کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں طلبہ کو یہ خیال رکھنے کی ہدایت کی جاتی تھی، کہ جو چیزیں انہیں حاصل ہوں وہ حلال کی کمائی کی ہوں، اسی طرح ایسی چیزوں کے کھانے سے پرہیز کریں جو کند ذہنی پیدا کرتی ہیں اور ایسی غذائیں کھائیں جو ان کے دل ودماغ کو قوت بخشیں۔

کم خوابی: طالب علموں کو کم سونے کا مشورہ بھی دیا جاتا تھا، اگر چہ سونے کے لیے ۲۴ گھنٹوں میں سے ۸ گھنٹوں کی اجازت تھی لیکن عملی طور پر اہل علم وطالب علم بہت کم سوتے تھے اور رات کا بڑا حصہ تعلیم اور مطالعہ میں صرف کرتے تھے، بلکہ کبھی رات کی رات گذار دیتے تھے، زرنوجی کا بیان ہے کہ:

"امام حسن بن زیاد نے ۸۰ سال کی عمر پائی، جس میں چالیس سال ایسے گذار دیے کہ ان کی پیٹھ بستر سے نہیں لگی"۔

امام محمد بن حسن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رات رات بھر جاگتے تھے اور پیالہ میں پانی بھر کر رکھتے تھے، جب نیند آتی تو منہ پر پانی کی چھینٹیں مار لیتے تھے، وہ راتوں کو جاگ کر مسائل حل کر لیتے اور فرماتے "یہ لذتیں شاہزادوں کو کہاں نصیب ہیں" اور ان کے شاگرد قاضی اسد بن فرات نے بھی بیان کیا ہے کہ امام محمد نیند سے ہشیار کرنے کے لیے ان کے منہ پر پانی کی چھینٹیں مارتے تھے۔

ابوعلی ابن سینا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پوری رات کبھی نہیں سویا اور نہ دن کا بڑا حصہ مطالعہ کے سوا کسی دوسرے کام میں لگایا۔(۱)

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۷۵ تا ۷۸۔

وقت کی قدر و قیمت: علمائے اسلام وقت کی بڑی قدر کرتے تھے اور شاگردوں کو اس کی تلقین کیا کرتے تھے، امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

> ''میں ان وقتوں کے کھونے پر افسوس کرتا ہوں جو علم سے بے تعلق ہو کر کھانے پینے میں صرف ہوتے ہیں، ہمیں وقت اور زمانہ بے حد عزیز ہے''۔(۱)

نظامِ اوقات: طالب علموں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے دن رات کو چوبیس گھنٹوں میں اس طریقہ سے تقسیم کریں کہ جس وقت جس قسم کا تعلیمی مشغلہ مناسب ہو انجام پائے، مثلاً صبح نور کے تڑکے حفظ کے لیے مقرر تھا، صبح سبق کی تکرار اور بحث کے لیے، دن چڑھے کتابت کے لیے اور شب مطالعہ اور مذاکرہ کے لیے، بعض لوگ اس سے کسی قدر مختلف نظام اوقات بھی بیان کرتے ہیں۔(۲)

غیر سودمند صحبتوں سے اجتناب: طالب علموں کو عام معاشرتی زندگی کی چہل پہل سے دور رہنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، خصوصاً انہیں غیر جنسوں کی صحبتوں سے علاحدہ رکھا جاتا تھا، وہ صرف ان ہی لوگوں سے ملتے جلتے جن سے یا تو وہ خود فائدہ اٹھاتے یا ان سے فائدہ اٹھایا جاتا، بلکہ اگر طالب علم کسی صحبت میں کسی علمی فائدہ کی امید میں شریک ہوتے اور ان کی توقع اس سے پوری نہ ہوتی تو چند دنوں کے تجربہ کے بعد اس سے قطع تعلق کر لیتے تھے۔(۳)

حفظان صحت کا خیال: طالب علموں کو حفظان صحت کے اصولوں کی تلقین کی جاتی تھی، صحت کے لیے مضر غذاؤں کے استعمال سے روکا جاتا اور صحت بخش غذائیں اور دوائیں انہیں بتائی جاتی تھیں، اگر وہ شادی شدہ ہوتے تو فریضۂ زوجیت کی ادائی میں اعتدال رکھنے کی ہدایت کی جاتی تھی، اس کی کثرت کے نقصانات سمجھائے جاتے تھے، نزہت گاہوں میں سیر کرائی جاتی، خصوصاً صحت کی بقا اور جسم کی ریاضت کے لیے چہل قدمی کے

---

(۱) طبقات الشافعیہ جلد۲ ص۳۷ و تعلیم المتعلم ص۵۰، ۵۱، ۵۲۔ (۲) تذکرۃ السامع ص۷۲، ۷۳۔ (۳) تذکرۃ السامع ص۸۳۔

معمول بنا لینے کی ہدایت کی جاتی تھی، قاضی ابن جماعہ نے ان میں سے ہر ایک کو علاحدہ علاحدہ تفصیل سے لکھا ہے۔(۱)

استاذ کی صحبتوں میں نشست: طالب علم استاذ کے درس کے حلقہ میں حاضر ہونے کے علاوہ اس کی دوسری مجلسوں میں شریک رہتے تھے اور اس کی گفتگوؤں سے علمی فائدے حاصل کرتے، مذاکروں میں تہذیب اور ادب سے حصہ لیتے اور ان مجلسوں سے واپس آ کر کار آمد باتیں لکھ لیتے تھے، اگر ان مجلسوں میں کوئی شریک نہ ہو سکتا تو وہ اپنے ان ساتھیوں سے مذاکروں کا حال دریافت کرتا جو ان مجلسوں میں شریک رہے ہوں، نیز مجلس کے برخاست ہونے کے بعد وہ باہم ان مسئلوں پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے، طالب علموں کو ان مذاکروں سے بڑے فائدے پہنچتے تھے۔(۲)

مذاکرہ اور تکرار: طالب علم آپس میں بھی علمی مذاکرے کرتے تھے، جریر کہتے ہیں کہ "ان کے ساتھی اعمش کے درس کے حلقہ سے اٹھنے کے بعد ان کے مکان پر اکٹھا ہوتے تھے اور ان سے مذاکرہ کے بعد اعمش کے حلقہ کی تمام حدیثیں لکھ لیتے تھے"۔

مذاکرہ کا اس قدر اہتمام تھا کہ اگر دو طالب علم بھی جمع ہوتے تو مختلف مسئلوں پر مذاکرہ کرتے اور اگر دو جمع نہ ہو سکتے تو طالب علم کو رات کی تنہائی میں فرضی طور پر کسی کو موجود قرار دے کر اس سے کسی علمی مسئلہ پر مذاکرہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، وہ خود سوال کرتا اور اس کے تشفی بخش جواب اپنے ہی ذہن سے حاصل کرتا، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے طلبہ کو یہی مشورہ دیا ہے۔(۳)

مختلف علما کے سوانح میں ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ان کے مذاکروں کے حالات ملتے ہیں۔

امام ابو یوسف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فقہ کے مسائل پر بڑی توجہ سے فقہا سے

---

(۱) تذکرۃ السامع [illegible] (۲) [illegible] ۱۴۴ (۳) تذکرۃ السامع [illegible]

مذاکرہ کرتے تھے، امام اعظمؒ مذاکرہ کا سلسلہ اپنی دکان ہی پر جاری رکھتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے علم فقہ میں اسی کے ذریعہ سے جلا پیدا کی۔(۱)

ابوبکر خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ ”میں برقانی کے ساتھ حدیثوں کا کثرت سے مذاکرہ کرتا تھا، وہ اسے لکھ لیتے اور اپنے مجموعہ میں شامل کر لیتے تھے۔(۲)

درس کے خالی وقتوں میں طالب علم سبق کو آپس میں مل کر دہراتے تھے اور اسے تکرار کہتے تھے، اس سے بہت سی باتیں جو ایک طالب علم کو یاد نہ رہ جاتی تھیں وہ دوسرے طالب علموں سے یاد آجاتی تھیں۔

کتابوں کی تعظیم: طالب علم کتابوں کا بڑا احترام کرتے تھے، کیوں کہ علم کی تعظیم یہ بھی تھی کہ کتاب کی تعظیم کی جائے، شمس الائمہ حلوائی فرماتے:

”میں نے یہ علم تعظیم سے حاصل کیا، میں نے کبھی کوئی کاغذ پاکی کے بغیر ہاتھ میں نہیں لیا“۔

طالب علموں کو کتاب کی طرف پیر پھیلانے سے منع کیا جاتا تھا، کتاب پر کوئی دوسری چیز رکھنے کی اجازت نہ تھی، یہاں تک کہ دوات بھی رکھی نہ جاسکتی تھی لیکن بعض علما نے اس کی اجازت دی ہے کہ اگر کتاب کی توہین کا خیال نہ ہو تو ایسی چیزیں کتابوں پر رکھی جاسکتی ہیں، تاہم احتیاط اولیٰ ہے۔(۳)

طلبہ اور ان کی کتابیں: طالب علموں کے تعلیمی مشاغل میں کتابوں کا نقل کرنا بھی تھا، اس زمانہ میں کتابوں کے حاصل کرنے کے چند ذرائع تھے، اگر طالب علم دولت مند ہوتے تو کتابیں خریدتے یا اجرت دے کر نسخ کراتے، ورنہ کسی سے عاریۃً مانگتے یا خود نقل کرتے۔

ان مختلف شکلوں کے لحاظ سے طالب علموں اور ان کی کتابوں کے متعلق حسب ذیل اصول اور طریق عمل جاری تھے۔

---

(۱) تعلیم المتعلم ص ۱۸۔ (۲) ابن عساکر جلد ا ص ۳۹۸۔ (۳) تعلیم المتعلم ص ۲۶۔

۱۔ دولت مند طالب علموں کو کتابیں خریدنے یا نسخ کرانے کا مشورہ دیا جاتا تھا انہیں نہ خود لکھنے کی اجازت تھی اور نہ کتابیں مستعار لینے کی۔

۲۔ مستعار کتابوں پر کچھ لکھنا، حاشیہ چڑھانا، یا کوئی نشان بنانا تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ کتابوں کے نسخ کرنے میں چند آداب مقرر تھے:

الف: خط کے حسن وخوبی میں مبالغہ کرنے اور نوک و پلک نکالنے میں وقت ضائع کرنے سے روکا جاتا تھا، صرف خط صاف ستھرا ہونا چاہیے تھا۔

ب: مذہبی کتابوں کے نسخ میں ذیل کے آداب ضروری تھے، جسم طاہر ہو، کپڑے صاف ستھرے ہوں، روشنائی پاک ہو، لکھتے وقت قبلہ کی طرف منہ ہو، اللہ تعالیٰ کے نام کے سامنے تعظیمی فقرے "تعالیٰ سبحانہ یا عزوجل" لکھے جائیں، آنحضرت صلعم کے نام مبارک کے آگے "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھا جائے، صحابہ کے لیے "رضی اللہ عنہ" اور ائمہ سلف کے لیے "رحمہ اللہ تعالیٰ"۔

ج: سلف کے نزدیک مہین حروف میں لکھنا پسندیدہ نہ تھا، یہ مقولہ مشہور ہے کہ:

> "ایسا لکھو، کہ جب تمہارے پاس اس کی ضرورت کا وقت آئے تو وہ کام دے، ایسا نہ لکھو کہ بوقت حاجت یعنی ضعیفی میں ضعف بینائی کے وقت وہ تمہارے کام نہ آئے"۔

امام ابوحنیفہ نے ایک شخص کو مہین حروف میں لکھتے دیکھا تو فرمایا:

> "باریک مت لکھو ورنہ اگر تم زندہ رہے تو تمہیں ندامت ہوگی اور مر گئے تو گالی سے یاد کیے جاؤ گے"۔

۴۔ کتابت کا آغاز بسملہ کے بعد حمد وصلوٰۃ سے کیا جائے۔

۵۔ جزء اور کتاب کے ختم پر خاتمہ کا نشان بنایا جائے۔

۶۔ اگر کوئی عبارت مکرر ہو جائے تو اسے قلمزد کرنے کے بجائے، اس سطر کے ذرا اوپر خط یا نقطے دیے جائیں۔

۷۔ کتاب کے بابوں اور فصلوں کو سرخ روشنائی سے لکھا جائے، پوری کتاب کو سرخ روشنائی سے لکھنا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔

۸۔ دو سطروں کے درمیان کی جگہ میں نہ لکھا جائے۔

۹۔ تصحیح، شک وسوال اور کلام کے خاتمہ وغیرہ کی مقررہ علامتیں کتاب میں لکھی جائیں۔

۱۰۔ کتابت کی تاریخ کو ضبط تحریر میں لایا جائے۔

۱۱۔ الماری میں کتابیں علوم کی تقسیم اور ان کی اہمیت کے اعتبار سے اوپر نیچے رکھی جائیں۔

اسی طریقہ سے روشنائی اور قلم بنانے اور چاقو کے مناسب طور پر استعمال کرنے کے طریقے بتائے جاتے تھے، ناموں اور لفظوں کے حروف کو ضبط میں لانے، غلط کتابت کی تصحیح کرنے، اصل متن پر حواشی بڑھانے، کوئی اعتراض وارد کرنے یا شک رفع کرنے، کتابوں کے مطالعہ کے وقت انہیں مناسب طریقہ سے سامنے رکھنے وغیرہ کے آئین اور آداب مقرر تھے، جنہیں قاضی ابن الجماعہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔(۱)

استاذ کی اطاعت: شاگرد کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ استاذ کا کامل مطیع اس طریقہ سے ہو جیسے ایک مریض ماہر طبیب کے آگے ہوتا ہے، اسے ہر وقت استاذ کے چشم وابرو کے اشارے پر چلنے کے لیے تیار اور اس کی ہر قسم کی خدمت گذاری پر مستعد رہنا چاہیے، حضرت ابن عباسؓ اپنی بزرگی اور مرتبہ کے باوجود حضرت زید بن ثابتؓ انصاری کی رکاب پکڑ کر چلتے اور فرماتے تھے کہ ''ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اپنے علما کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں'' حضرت شعبہؒ

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۶۳ تا ۱۹۳۔

کہتے ہیں کہ ”میں نے جس شخص سے ایک حدیث بھی سنی زندگی بھر اس کا غلام بنا رہا“۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ:

”میں اس شخص کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی پڑھایا اسے اختیار ہے چاہے وہ مجھے بیچ دے، چاہے آزاد کرے، چاہے غلام بنائے رہے“۔(۱)

قاضی فخر الدین ارسابندی مرو کے بڑے امام سمجھے جاتے تھے، بادشاہ وقت ان کی تعظیم کرتا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ:

”مجھے یہ منصب استاذ کی عزت کرنے سے حاصل ہوا ہے، میں اپنے استاذ ابوزیدی دبوسی کی خدمت کرتا تھا، ان کا کھانا پکاتا اور اس میں سے خود نہ کھاتا تھا“۔(۲)

خلیفہ ہارون رشید کا لڑکا اصمعی سے علم ادب پڑھتا تھا، ایک مرتبہ خلیفہ اصمعی کے مکان کی طرف سے گذرا اور دیکھا کہ اصمعی وضو کرنے میں پاؤں دھو رہے ہیں اور شاہزادہ پانی ڈال رہا ہے، خلیفہ یہ دیکھ کر برہم ہوا اور اصمعی سے کہا:

”میں نے اس لڑکے کو تمہارے یہاں ادب سیکھنے کے لیے بھیجا ہے، تم اپنا پاؤں اپنے ہاتھ سے کیوں دھو رہے ہو، اس سے دھلانا چاہیے تھا، ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا دوسرے سے پاؤں دھوتا“۔(۳)

استاذ وشاگرد کی باہمی معاشرت اور استاذ کے ادب واحترام کے آئین وطریق: قاضی ابن الجماعہ نے ایسے آداب اور آئین جنہیں اسلامی نقطۂ نظر سے شاگردوں کو اپنے استاذ کے ساتھ معاشرتی زندگی میں برتنا چاہیے، تفصیل سے بیان کیے ہیں، ان سے اسلامی عہد میں استاذ وشاگرد کی باہمی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ طالب علموں کا فرض ہے کہ وہ استاذ کو عظمت کی نگاہ سے دیکھیں اور یقین

(۱) تعلیم المتعلم ص ۲۳۔ (۲) ایضاً ص ۲۵۔ (۳) ایضاً ص ۲۵۔

رکھیں کہ وہ کمال کے درجہ پر فائز ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب میں امام مالک کے سامنے کتاب کا ورق الٹتا تھا، تو ان کی ہیبت کی وجہ سے اس قدر آہستہ الٹتا، کہ وہ سننے نہ پاتے، ربیعہ کہتے ہیں کہ "خدا کی قسم میں نے امام شافعی کے سامنے ان کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے کبھی پانی پینے کی جرأت نہ کی"۔

۲۔ اگر استاذ کوئی حکم دینے میں غلطی بھی کرے، تو اسے صواب سمجھ کر تسلیم کر لینا چاہیے، حضرت موسیٰ اور خضرؑ کے قصہ میں اس کا اشارہ موجود ہے۔

۳۔ استاذ کو کسی عام خطاب سے مخاطب کرنے کے بجائے "یاسیدی" "یا استاذی" وغیرہ سے مخاطب کرنا چاہیے اور اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کا نام تعظیمی الفاظ بڑھائے بغیر زبان پر نہ لانا چاہیے، علمائے اسلام اپنے اساتذہ کے ساتھ یہی ادب برتاو کیے، خواہ اپنے علم وفضل کے بلند سے بلند درجہ پر بھی فائز ہو گئے ہوں۔

۴۔ ہر مجلس میں استاذ کی عزت اور حرمت کا لحاظ رکھنا چاہیے، اگر کسی موقع پر کوئی شخص اس کی شان میں ادب سے پیش نہ آئے یا ناروا نکتہ چینی کرے، تو فوراً اپنی ناراضی ظاہر کر کے اس کی مدافعت کرنی چاہیے اور اگر غیظ وغضب کے ظاہر کرنے کا موقع نہ ہو تو اس مجلس سے اٹھ جانا چاہیے۔

۵۔ علوم وفنون میں اس کے نظریوں اور خیالوں پر عبور رکھنا چاہیے، انہیں دل نشیں رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور اس کے مسلک کی پیروی کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔

۶۔ اس کی عادتوں اور خصلتوں کی پیروی کرنی چاہیے۔

۷۔ اس کی زندگی میں اس کے لیے بھلائی کی دعا کرنی چاہیے اور اس کی وفات کے بعد اس کی قبر کی زیارت کر کے اس کے لیے مغفرت کی دعا مانگنی چاہیے اور اس کی اولاد اور عزیز واقارب سے محبت اور تعظیم سے پیش آنا چاہیے کہ اصل میں یہ تعظیم اپنے استاذ کی ہوگی۔

ہدایہ کے مصنف شیخ الاسلام برہان الدین بیان کرتے ہیں کہ "امام بخاری کے

شیوخ میں سے ایک بزرگ درس کی مسند پر تشریف فرماتھے، ایک مرتبہ ان کی یہ عجیب وغریب کیفیت دیکھی گئی کہ وہ درس کے درمیان میں رہ رہ کر رک جاتے ہیں اور پھر اضطراب سے کسی کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

''میرا استاذ زادہ بچوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہا ہے، وہ کھیلتے کھیلتے مسجد کے دروازہ پر آجاتا ہے، جب میری نظر پڑتی ہے تو استاذ کی تعظیم کے خیال سے ان کے صاحبزادہ کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں''۔ (تعلیم المتعلم)

۸۔ اگر استاذ کی طرف سے کوئی زیادتی یا سوء خلقی ظاہر ہو تو اس کا کوئی اثر نہ لینا چاہیے اور اس کی وجہ سے اس کی صحبت میں جانے سے گریز نہ کرنا چاہیے، بلکہ اس کے طرز عمل کی کوئی تاویل کر کے اپنے دل کو سمجھالینا چاہیے۔

۹۔ استاذ جو کچھ رشد وہدایت کی راہ دکھائے، اس پر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

۱۰۔ اگر استاذ کسی وقت کوئی باریک علمی نکتہ بیان کرے اور شاگرد اس سے پہلے سے آگاہ ہو تو بھی اسے پوری توجہ سے سننا چاہیے اور اس نکتہ کے مرحمت کرنے پر استاذ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

۱۱۔ استاذ کے یہاں بغیر اجازت حاصل کیے نہ جانا چاہیے، عام اس سے کہ وہ تنہا ہو یا کوئی دوسرا شخص اس کے پاس بیٹھا ہو، اگر استاذ کسی وجہ سے اجازت دینے میں تامل کرے تو اجازت حاصل کرنے پر اصرار نہ کرنا چاہیے لیکن اگر یہ شبہ ہو کہ استاذ کو اس کی آمد کی اطلاع نہیں ہوئی تو تین مرتبہ سے زیادہ اپنی اطلاع نہ کرائے، اگر اطلاع دینے کے لیے دروازہ پر کھٹکھٹانا ہو تو پہلے آہستہ سے انگلیوں کے ناخن سے کھٹکھٹانا چاہیے، اگر اندر آواز نہ پہنچے تو انگلیوں سے کھٹکھٹائے، اس کے بعد آہستہ آہستہ ہتھیلی مارے، اگر اس کے باوجود جواب نہ آئے تو لوٹ آنا چاہیے۔

۱۲۔ استاذ کی خدمت میں صاف ستھرے کپڑے پہن کر جانا چاہیے اور حجامت بڑھی نہ ہو۔

۱۳۔ اگر استاذ کے پاس پہنچ کر معلوم ہو کہ وہ کسی کام میں مصروف ہے تو وہاں پر خاموشی سے کھڑا نہ رہنا چاہیے، بلکہ فوراً لوٹ آنا چاہیے، اگر استاذ اس کو روکنا چاہے گا تو خود ٹھہرائے گا۔

۱۴۔ استاذ سے پڑھنے پڑھانے کے لیے کسی ایسے وقت کا مطالبہ نہ کرنا چاہیے جو اس پر گراں گذرے۔

۱۵۔ استاذ کی سامنے پورے ادب سے بیٹھنا چاہیے، بیٹھنے میں تواضع، انکسار اور خشوع وخضوع ظاہر ہو، اس کی طرف متوجہ رہنا چاہیے، دائیں بائیں بلاضرورت نہ دیکھنا چاہیے، نہ ایسی حرکتیں کرنی چاہئیں جن سے استاذ کی توجہ ہٹ جائے، بعض لوگ بیٹھے بیٹھے اپنے کپڑوں سے کھیلنے لگتے ہیں، بعض ناخن چباتے ہیں، بعض اپنے ہاتھ داڑھی پر رکھتے ہیں، بعض لوگ داڑھی کے بال ناک میں لے جاتے اور نکالتے ہیں، بعض زمین پر لکیریں بناتے ہیں، یہ اور اس قسم کی تمام عادتیں آداب وتہذیب کے منافی ہیں، ان سے استاذ کے سامنے احتیاط لازم ہے۔

۱۶۔ اسی طرح اٹھنے بیٹھنے کے جتنے معلوم طریقے ہیں، ان میں جو غیر مہذب اور بے تکلفی کے طریقے ہیں، انہیں استاذ کے سامنے اختیار نہ کرنا چاہیے۔

۱۷۔ استاذ کے سامنے بلاضرورت کھانسنا، تھوکنا اور ناک صاف کرنا برا ہے، اگر ضرورت پڑے تو مہذب طریقے سے کرنا چاہیے، رومال سے صاف کرنا چاہیے، اسی طرح بے تکلف ہو کر ہنسنا اور مسکرانا بھی ادب کے خلاف ہے، ان تمام عادتوں کے متعلق علمائے سلف کے بہت سے اقوال اور واقعات ہیں جن کا یہاں تذکرہ کرنا طولِ عمل ہے۔

۱۸۔ استاذ کے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھنا روا نہیں، نہ اس کے سجادہ اور مصلّی پر قدم

رکھنا چاہیے، نہ اس کے تکیہ سے ٹیک لگانا چاہیے، البتہ اگر استاذ حکم دے اور اصرار کرے تو حکم کی تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۱۹۔ استاذ سے ہم کلام ہونے میں تہذیب اور ادب کا لحاظ رکھنا چاہیے، ''کیوں'' میں تسلیم نہیں کرتا'' ''یہ کہاں ہے''؟ یہ اور اس قسم کے فقرے ادب کے خلاف ہیں، ان ہی مطلبوں کو مناسب لفظوں میں تہذیب سے ادا کرنا چاہیے۔

۲۰۔ اگر استاذ کسی مسئلہ میں ایسی دلیل دیتا ہو اور اس پر اصرار کرتا ہو، جسے شاگرد کا دل قبول نہ کرے، تو بھی اصرار کی صورت میں خوشی سے اسے قبول کر لینا چاہیے۔

۲۱۔ اگر استاذ کی شان میں کسی دوسرے نے کوئی نا ملائم بات کہی ہو تو اسے استاذ کے سامنے ''نقل کفر کفر نہ باشد'' سمجھ کر بلا تکلف دہرانہ دینا چاہیے، بلکہ اس مفہوم کو اشارہ اور کنایہ ہی سے ادا کرنا چاہیے۔

۲۲۔ استاذ سے کسی مسئلہ یا سوال جواب میں ردوکدنہ کرنا چاہیے، اگر وہ کسی بات کے متعلق کہے کہ ''کیا تم نے ایسا نہیں کیا تھا''؟ ''یا تمہارا یہ مقصد نہ تھا'' تو اس کے جواب میں فوراً تردید کے لیے تیار نہ ہو جانا چاہیے، بلکہ خاموش رہے اور اگر سوال کا جواب باصرار مانگا جائے تو تہذیب کے ساتھ لطیف انداز میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دے۔

۲۳۔ استاذ کے کلام کے سلسلہ کو بیچ سے نہ توڑنا چاہیے اور نہ اس کی گفتگو کے درمیان اپنی جماعت کے کسی دوسرے شخص سے باتیں کرنی چاہیے۔

۲۴۔ استاذ کے سامنے اپنا ذہن حاضر رکھنا چاہیے، اگر وہ کسی کام کا حکم دے یا کسی بات کے متعلق کچھ دریافت کرے، یا کسی جانب کوئی اشارہ کرے، تو فوراً امتثال امر کے لیے تیار ہو جانا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ غفلت میں اس کی طرف دھیان نہ رہے اور اسے اپنی بات کے دہرانے کی ضرورت پڑے۔

۲۵۔ اگر استاذ کوئی چیز طالب علم کی طرف بڑھائے تو اسے داہنے ہاتھ سے فوراً

لینا چاہیے، اگر وہ کوئی تحریر ہو تو اسے فوراً پڑھنا چاہیے، اگر استاذ اوراق کا کوئی مجموعہ دینا چاہے اور اس کے پڑھنے کے وقت اس کے اوراق پریشاں ہو گئے ہوں، تو بڑھ کر اسی حالت میں استاذ کے ہاتھ سے لے لینا چاہیے، استاذ کے ترتیب دینے کا انتظار نہ کرنا چاہیے، بلکہ لے کر خود مرتب کرنا چاہیے اور اگر وہ کسی کتاب میں کوئی چیز پڑھنے کے لیے بڑھائے اور وہ کتاب کسی صفحہ پر کھلی ہوئی ہو، تو اسی طرح پڑھ کر اسی کھلے ہوئے صفحہ کے ساتھ واپس کرنا چاہیے۔

۲۶۔ استاذ سے اس قدر قریب نہ ہونا چاہیے کہ اس کے کپڑوں سے چھو جانے کا اندیشہ ہو اور نہ اس کے سامنے کچھ دیکھنے کے لیے اس قدر جھکنا چاہیے کہ اس کے پہلو سے مس ہو جانے کا اندیشہ ہو، یہ حرکتیں ادب کے خلاف ہیں۔

۲۷۔ جب استاذ مجلس سے اٹھ کر جانے کے لیے تیار ہو، تو اس کی جانماز اٹھا کے اور اس کے جوتے سیدھے کرنے کے لیے عجلت کے ساتھ بڑھنا چاہیے، بشرطیکہ استاذ کو یہ ناگوار نہ گذرے اور اس فعل سے اللہ کے نزدیک تقرب اور استاذ کے دل میں جگہ پانے کی نیت رکھی جائے۔

۲۸۔ اگر استاذ کے ساتھ راہ چلنے کا اتفاق ہو، تو ضرورت کے وقت شب میں اس کے آگے چلنا چاہیے، تاکہ اس کے چلنے سے استاذ کے لیے راستہ صاف اور چلا ہوا معلوم ہو اور دن کے وقت اس کے پیچھے چلنا چاہیے لیکن اگر راستہ میں بھیڑ ہو تو راستہ بنانے کے لیے آگے چلنا چاہیے، اگر رات کے وقت آگے جانے کا اتفاق ہو تو بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے جانا چاہیے کہ استاذ بلا زحمت راستہ طے کر رہا ہے۔

اگر استاذ راستہ میں کچھ باتیں کرے تو اس کے دائیں جانب اور بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق بائیں طرف اس سے تھوڑے فاصلہ پر پیچھے رہ کر اس کی باتیں سنے، استاذ کے پہلو بہ پہلو صرف ضرورت ہی کے وقت چلنا روا ہو سکتا ہے، یا اس نے خود اشارے سے

اپنے ساتھ چلنے کے لیے بلا لیا ہو، اس صورت میں مونڈھے اور ہاتھوں کو استاذ کے جسم سے چھو جانے سے بچائے اور اگر گرمی کا زمانہ ہو تو اس طریقہ سے چلنا چاہیے کہ اس کا سایہ استاذ کے جسم پر پڑے اور اگر جاڑے کے دن ہوں تو یہ لحاظ رہے کہ دھوپ اس کے جسم پر لگے، اگر استاذ راستہ میں کسی دوسرے شخص سے باتیں کرنے لگے تو اس قدر پیچھے ہو جانا چاہیے کہ اس کی باتیں نہ سن سکے اور اگر قرینہ سے یہ معلوم ہو کہ اس گفتگو میں وہ شریک سمجھا جا رہا ہے تو جو پہلو استاذ کے مخاطب سے خالی ہو، اس پہلو پر آ جانا چاہیے۔

۲۹۔ اگر استاذ راہ میں مل جائے تو اسے عجلت سے سلام کرنا چاہیے لیکن سلام دور سے کرنا مناسب نہیں اس کے قریب سامنے آ کر سلام کرنا چاہیے۔(۱)

طلبہ میں تعلیم کا شوق اور جدوجہد: اس زمانہ میں طالب علموں میں تعلیم و تحصیل کا بڑا شوق تھا، سید شریف جرجانی کی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ انہیں شرح مطالع کو اس کے مصنف سے پڑھنے کا شوق ہوا، چنانچہ وہ امام رازی کی خدمت میں پہنچے، مگر وہ ضعیف ہو چکے تھے، پڑھانے سے معذور تھے، انہوں نے انہیں سفارشی خط دے کر اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس قاہرہ بھیجا، مبارک شاہ نے انہیں حلقۂ درس میں صرف سماع کی اجازت دی، مستقل درس اور قرأت کا موقع نہ دے سکے، چنانچہ ان کی تعلیم جاری ہو گئی، ایک مرتبہ رات کے وقت مبارک شاہ اپنے حجرے سے نکل کر مسجد کے صحن میں آئے، یہاں ایک طالب علم کو زور کی آواز میں یوں پڑھتے سنا "مصنف نے یوں کہا" "شارح یہ کہتا ہے" "اور میں یہ کہتا ہوں" معلوم ہوا یہ سید شریف جرجانی ہیں، استاذ کو طالب علم کی یہ محنت اور شوق طلب پسند آیا اور دوسرے دن انہیں حلقۂ درس میں سب طالب علموں پر مقدم کر دیا۔(۲)

---

(۱) تذکرۃ السامع از ص ۸۷ تا ۱۱۲، اسی قسم کے آداب امام غزالی نے احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۲ تا ۳۵ میں اور زرنوجی نے تعلیم المتعلم میں اجمال کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ (۲) الشقائق النعمانیہ بر حاشیہ ابن خلکان جلد ۱ ص ۱۶۷، ۱۶۸۔

شیخ ابو علی ابن سینا کا بیان ہے کہ انہوں نے طالب علمی کے زمانہ میں کتاب مابعد الطبعیہ پڑھنی شروع کی مگر سمجھ میں نہ آئی، سمجھنے کے لیے اسے بار بار پڑھتے مگر مفہوم واضح نہ ہوتا، یہاں تک کہ چالیس مرتبہ اسے پڑھ ڈالا اور کتاب ازبر ہوگئی، پھر اتفاق سے ایک دن بازار میں اسی فن کی ایک کتاب ہاتھ آگئی، اسے بھی بادل ناخواستہ خرید لیا، پھر دیکھا تو یہ ابونصر فارابی کی تصنیف تھی، جس میں اس نے کتاب مابعد الطبعیہ کے اغراض کی تشریح کی تھی، کتاب پہلے ازبر ہو چکی تھی، اس شرح نے مشکلات کے تمام پردے چاک کر دیے۔(۱)

کتاب الحماسہ کے شارح خطیب تبریزی کی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ فن لغت میں ابوالمنصور کی کسی کتاب کے مطالب حل کرنے کے لیے اپنے شہر کے کسی لغوی کے پاس پہنچے، اس نے کہا کہ ابوالعلاء معری کی طرف رجوع کرو، چنانچہ وہ تبریز سے معری روانہ ہوگئے، ابوالعلاء معری سے مل کر اس کے مطالب حل کیے۔(۲)

مشہور نحوی ولغوی اسود کے متعلق مشہور ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں چہرے پر تیل مل کر دھوپ میں بیٹھ جاتا تھا، تاکہ بدویوں سے ہم شکل ہو جائے اور ان سے مل جل کر لغت کی تحصیل کر سکے، چنانچہ وہ نہ صرف اپنے فن میں امام بلکہ اسی لقب اسود سے مشہور ہوگیا۔(۳)

تعلیمی وعلمی حمیت: اس زمانہ کے طالب علموں اور فارغ التحصیل طلبہ میں پوری تعلیمی وعلمی حمیت پائی جاتی تھی، ابن جنی نحوی کا نام مشہور ہے، وہ تحصیل علم سے فارغ ہو کر درس دینے کے لیے بیٹھا، اتفاق سے اس کے حلقہ میں نحو کا مشہور امام ابوعلی فارسی پہنچ گیا اور کسی مسئلہ میں اس نے ابن جنی کی غلطی دیکھی، ابوعلی صرف اس قدر کہہ کر اٹھ گیا زبیت قبل ان تحصرم، تم انگور بننے سے پہلے منقی بن گئے، یعنی ابھی گدرانے بھی نہ پائے تھے،

(۱) عیون الانباء جلد ۲ ص ۴۔ (۲) وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۲۴۳۔ (۳) نزہۃ الالباء ص ۴۳۷۔

کہ پختہ کار ہو گئے، یہ فقرہ ابن جنی کے دل میں کھپ گیا، اسی وقت دامن جھاڑ کر درس کی سند سے اٹھ کھڑا ہوا اور منزل منزل طے کر کے ابوعلی سے جاملا اور زندگی بھر اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور پھر خود امام فن کہلایا۔(۱)

ایک دوسرے نحوی کسائی کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایک غلط لفظ کسی محفل میں بول گیا، اسے ٹوکا گیا جس سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت اس فن میں کمال حاصل کرنے کا تہیہ کیا، چنانچہ نحو کے استاذ خلیل بصری کے حلقہ میں داخل ہوا، یہاں تحصیل کرنے کے بعد اسے خیال ہوا کہ جیسے خلیل نے اسے حاصل کیا ہے، وہ بھی حاصل کرے، چنانچہ بدوؤں سے ملنے کے لیے بادیہ پیمائی شروع کی اور کمال حاصل کر کے امام فن کہلایا۔(۲)

---

(۱) نزہۃ الالباء ص ۴۰۸۔ (۲) ایضاً۔

(۶)

حلقۂ درس

اساتذہ کا ورود حلقۂ درس میں: اسلامی عہد کے درس کے حلقوں (کلاس) کا نظارہ ذیل کے بیان سے ہوگا، جسے قاضی ابن جماعہ نے اساتذہ وطلبہ کے آداب میں بیان کیا ہے۔

اساتذہ درس کے حلقہ میں جانے کے لیے اہتمام کرتے تھے، جیسے حلقہ میں صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر آتے تھے، امام مالک کا یہ معمول تھا کہ وہ جب حلقہ میں جانے کا تہیہ فرماتے، تو پہلے غسل کرتے، پھر اچھے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، اس کے بعد درس کے حلقہ میں تشریف لے جاتے۔

اساتذہ روانگی سے پہلے خیر وبرکت حاصل کرنے اور ضلالت اور گمراہی سے محفوظ رہنے کے لیے یہ دعائے ماثورہ پڑھتے تھے، اللّٰھم انی اعوذ بك ان اضل او اضل وازل اوازل واظلم او اظلم اجهل او اجهل علی۔(۱)

پھر ذکر الٰہی کرتے ہوئے درس کی مجلس میں آتے اور مجلس کے حاضرین کو سلام کرتے، یہاں پہنچ کر اگر کوئی مکروہ وقت نہ ہوتا تو دو رکعتیں نماز پڑھتے اور نماز کے بعد خشوع وخضوع سے توفیق خداوندی حاصل کرنے اور لغزشوں سے بچنے کی دعا کرتے، اس کے بعد قبلہ کی طرف منہ کرکے مجلس کے سامنے بیٹھ جاتے۔

اساتذہ کا طریقِ نشست: اساتذہ درس کے حلقہ میں جیسا کہ اوپر گذرا، کسی اونچے

(۱) ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۰۸۔

مقام کرسی یا منبر پر بیٹھتے تھے، بعض لوگ جو مسجد کے صحن میں درس دیتے تھے، وہ کسی نیچی دیوار یا کسی مینار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے اور بیٹھنے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرتے تھے جو اہل علم کی نشست کے وقار کے خلاف ہو۔

غیر سنجیدہ حرکتوں سے اجتناب: حلقہ میں غیر سنجیدہ حرکتوں سے باز رہتے تھے، ہنسی مذاق یا مزاح نہ کرتے تھے۔(۱) سالم بن جنادہ، حضرت وکیع بن جراح متوفی ۱۹۷ھ کے متعلق کہتے ہیں:

> ''میں وکیع کی معیت میں سات سال تک بیٹھا لیکن میں نے انہیں نہ کبھی تھوکتے دیکھا، نہ کسی کنکری سے کھیلتے ہوئے پایا، وہ جس نشست سے بیٹھتے پھر پہلو نہ بدلتے تھے، وہ ہمیشہ قبلہ رو ہو کر بیٹھا کرتے''۔(۲)

آغازِ درس: درس کا آغاز کسی خوش الحان قاری کی تلاوت قرآن سے کیا جاتا تھا، اس کے بعد ''مستملی ونقیب'' اہل مجلس کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے، اس کے بعد سب سے پہلے شیوخ بسملہ پڑھ کر صلوٰۃ اور سلام بھیجتے، پھر وہ اور تمام حاضرین دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے، اس کے بعد استعاذہ، بسملہ اور حمد وصلوٰۃ نئے سرے سے پڑھ کر درس کی تقریر جاری کرتے تھے۔(۳)

درس وافہام وتفہیم کا طریقہ: درس میں آواز نہ زیادہ بلند ہوتی اور نہ زیادہ پست، بلکہ اتنی ہوتی کہ مجلس کے حاضرین اسے آسانی سے سن سکیں اور آواز مجلس کے باہر نہ جانے پائے، مسائل کو ذہن نشین کرانے کے لیے عموماً جملوں کو تین مرتبہ دہراتے تھے، درس کے درمیان جہاں مسلسل بیان کی ضرورت ہوتی، تقریر مسلسل جاری رکھتے، جہاں امتیاز پیدا کرنا ہوتا، تو ٹھہر جاتے اور جب گفتگو منقطع کرنے کی ضرورت ہوتی، منقطع کر دیتے، اثنائے تقریر میں اگر اسلام کے خلاف کوئی شبہہ وارد ہوتا تو اسے بیان کرتے، مگر یہ پابندی رکھتے کہ اس کا

(۱) تذکرۃ السامع ص ۳۱، ۳۲۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۸۳۔ (۳) تذکرۃ السامع ص ۳۴، ۳۵۔

جواب بھی اسی مجلس میں شبہہ پیش کرنے کے بعد ہی بیان کردیں اور اگر جواب دینے کا موقع نہ ہوتا تو شبہہ کی تفصیل اور دلیل بیان کرنے کے بجائے صرف اشارہ کر کے تقریر ختم کردیتے اور اس کی تفصیل اور جواب کو دوسرے دن کے لیے اٹھا رکھتے تھے۔

درس کی تقریر نہ اتنی طویل ہوتی کہ غیر ضروری باتیں چھڑ جائیں اور نہ اس قدر مختصر کہ طالب علموں کی تشفی نہ ہوسکے(۱) اساتذہ درس کے اثنا میں طالب علموں سے حسن تلطف سے پیش آتے تھے، مسائل کو ان کی سمجھ کے مطابق آسان کر کے بیان کرتے تھے اور مسائل کی تمثیلات سے تشریح کرتے تھے(۲) اور لوگوں کے سوالوں کا جواب علاحدہ علاحدہ دیتے تھے اگر استاذ کوئی مسئلہ کسی کو سمجھاتا اور گفتگو کے درمیان کوئی دوسرا طالب علم کوئی شبہہ پیش کرتا تو گفتگو چھوڑ کر شبہہ پیش کرنے والے کو تسلی دیتے، کہ پہلے وہ اس شخص کی گفتگو ختم کرلیں تو اس کے شبہہ کو دور کریں گے، ربیع کہتے ہیں کہ امام شافعی کا بھی یہی طرز عمل تھا(۳) اور اگر کوئی شخص غیر ضروری ردوکد کرتا تو اسے تنبیہ کی جاتی تھی(۴) جو لڑکے کچھ کہنا چاہتے اور مفہوم ادا نہ کرسکتے تو استاذ ان کی مدد کرتا اور خاص توجہ سے ان کا مافی الضمیر معلوم کر کے ان کی تشفی کرتا۔(۵)

آزمائشی سوالات اور اثنائے درس میں طلبہ کی استعداد کا امتحان: اساتذہ درس کے درمیان طالب علموں سے آزمائشی سوالات کرتے تھے اگر جواب مشکل ہوتا تو طلبہ کو ایک ایک ہفتہ تک کی مہلت دی جاتی تھی کہ اس درمیان میں تیار ہو کر اس سوال کو حل کریں۔(۶)

کبھی دوسرے طریقوں سے طالب علموں کی استعداد کا امتحان لیا جاتا تھا، ابن ابی حناجر یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ ایک جماعت کے ساتھ مشہور محدث محمد بن

(۱) تذکرۃ السامع ص ۳۶ تا ۳۹۔(۲) ایضاً ص ۵۱، ۵۲۔۳) ایضاً ص ۴۰۔(۴) ایضاً ص ۴۱۔(۵) ایضاً ص ۴۲۔(۶) ایضاً ص ۵۳۔

مصعب عرقسانی کے یہاں حدیث سننے کے لیے پہنچے، شیخ نے مکان سے برآمد ہو کر کہا ابھی ایک شعر زبان پر آ گیا ہے، اگر تم میں سے کوئی بتا دے کہ یہ کس کا شعر ہے تو میں تین حدیثیں سناؤں گا، اس کے بعد شیخ نے وہ شعر پڑھا، ایک عراقی طالب علم نے آگے بڑھ کر اس شاعر کا نام بتایا، شیخ نے اس کی تصدیق کی اور پوچھا اس کے بعد کون سا شعر ہے، طالب علم نے اس کے بعد کا دوسرا اشعر سنانا، شیخ یہ سن کر خوش ہوئے اور شعر وادب میں امتحان لینے کے بعد حسب وعدہ ۶ حدیثیں انہیں سنائیں۔(۱)

نیز طلبہ کو جو چیزیں حفظ کرائی جاتی تھیں، اساتذہ ان میں سے بھی کبھی کوئی چیز کسی طالب علم سے امتحان کے طور پر پوچھ لیا کرتے اور صحیح جوابوں پر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔(۲)

اگر کبھی طالب علم کے جواب سے خوشی ہوتی اور اس کی کوئی ادا پسند آ جاتی تو اساتذہ طالب علموں کو انعام بھی دیتے تھے، ابو عبید کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد کے پاس امام شافعی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاضر تھے۔ امام محمد نے ان سے کوئی سوال کیا، امام شافعی نے اس کا جواب دیا اور جب امام محمد نے اس جواب کی تصدیق فرمائی تو امام شافعی نے اسے لکھ لیا، امام محمد کو امام شافعی کا یہ شوق علم پسند آیا اور خوش ہو کر سو درہم عطا کیے اور فرمایا کہ تم پابندی سے آیا کرو، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے ایک اونٹ کے بوجھ کی مقدار میں لکھا ہے۔(۳)

پردیسی طلبہ پر شفقت: اساتذہ اپنے درس کے حلقہ میں پردیسی طلبہ پر خاص شفقت کی نظر کرتے تھے، مجلس میں ان سے رعب دور کرنے اور ان کی دلدہی کے لیے ان سے مسلسل گفتگو کرتے اور رفتہ رفتہ وہ اجنبی طالب علم اپنے استاذ کی شفقت کے سایہ میں دوسرے ہم جماعت دوستوں سے گھل مل جاتے تھے(۴) اور اساتذہ کو حلقہ کے ہر طالب علم

(۱) مختصر جامع بیان العلم ص ۵۱۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۵۱۔۵۲۔ (۳) مفتاح السعادۃ جلد ۲ ص ۱۰۹۔

(۴) تذکرۃ السامع ص ۴۳۔

کے نام، نسب، وطن اور ضروری حالات سے باخبر رہنے کی تلقین کی جاتی تھی۔(۱)

حلقۂ درس میں معاصر علما کی شرکت اور اساتذہ کا برتاؤ ان کے ساتھ: جیسا کہ اوپر گذر چکا، درس کے حلقہ میں شاگردوں کے علاوہ استاذ کے ہمعصر علما بھی کبھی شرکت کرتے تھے اور انہیں حق حاصل تھا کہ وہ استاذ کی تقریر پر اپنے علم اور ادراک کے مطابق اعتراضات کریں، یا کسی مسئلہ میں استاذ کی رائے سے اتفاق نہ ہو تو دلائل سے اس کا رد کریں۔

اساتذہ بڑی خوشی سے اپنے درس کے حلقہ میں ان معاصرین کا استقبال کرتے اور ان کے شبہوں اور اعتراضوں کے جوابات دیتے تھے، جب استاذ کسی عالم یا فقیہہ کو اپنے حلقہ میں آتے دیکھتا، تو اس کی آمد کے انتظار میں اپنی تقریر روک دیتا تھا، جب وہ آکر بیٹھ جاتا تو اس مسلسل تقریر کے پچھلے حصہ کے ضروری جزوں کو نئے سرے سے اجمال کے ساتھ بیان کر کے پھر اپنی تقریر آگے جاری کرتا، اگر آنے والا کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب دیتا اور اگر اس کا جواب اس کے علم میں نہ ہوتا تو کج بحثی کرنے کے بجائے بلاتکلف اپنی لاعلمی ظاہر کرتا اور آنے والا اس مسئلہ پر جو کچھ بیان کرنا چاہتا بیان کرتا، معلموں کا ''لا ادری'' (میں نہیں جانتا)'' و لا اعلم '' (مجھے معلوم نہیں) کہنا ان کی کم علمی کے بجائے عالی ظرفی پر محمول کیا جاتا تھا۔(۲)

اگر ان مجلسوں میں ایک سے زیادہ اہل علم جمع ہوتے تو ایک دوسرے کے علم کا احترام کرتے تھے، امام اوزاعی سے ابو محمد سعید بن عبدالعزیز کی موجودگی میں اگر کوئی سوال کیا جاتا تھا تو فرماتے کہ ''ابو محمد سے پوچھو''۔(۳)

ترتیب حلقہ: استاذ کی بلند کرسی کے دائیں بائیں اگر ضرورت ہوتی، تو ''مستملی اور معید'' کھڑے رہتے سامنے کی نشست پر آگے ممتاز علما بیٹھتے، ان کے پیچھے اور دائیں بائیں شاگرد بیٹھتے تھے، ورنہ اگر موقع ہوتا تو طالب علم عموماً ایک ہی رخ پر بیٹھتے تھے تاکہ استاذ کی

(۱) تذکرۃ السامع ص ۶۱۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۴۲۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۰۲۔

توجہ ایک سمت پر مبذول رہے۔(۱)

قرأت کی باری: جب حلقہ میں کتابیں پڑھائی جاتی تھیں تو قرأت کی باری اس طالب علم کی ہوتی تھی جو درجہ میں پہلے آتا تھا، خواہ آنے والا اس مدرسہ کا طالب علم بھی نہ ہو، اگر دو طالب علم ساتھ آتے تو ان میں قرعہ ڈال کر فیصلہ کیا جاتا تھا، پہلے آنے والے کا یہ حق اخلاقی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، اگر وہ کسی ضرورت سے حلقہ سے اٹھ جانے پر مجبور ہوتا تو اس کا حق زائل نہ ہوتا تھا، وہ واپس آ کر پھر اپنی قرأت جاری کرتا تھا۔

البتہ اگر کوئی خاص وقت حلقہ کے مستقل طلبہ کے لیے مقرر کر دیا جاتا تو اس میں اجنبیوں کو یہ اجازت حاصل نہ ہوتی تھی۔(۲)

آدابِ درس: طالب علموں کے لیے درس کے حلقہ میں شریک ہونے کے لیے چند لوازم تھے، جن کی پابندی کرائی جاتی تھی، جیسے حلقہ میں استاذ سے پہلے حاضر ہو جائیں، کیوں کہ شاگردوں کو استاذوں کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے نہ کہ استاذوں کو لڑکوں کے آنے کا منتظر بنایا جائے۔

حلقہ میں اچھے، صاف ستھرے اور سنجیدہ لباس پہن کر آئیں، شیخ ابوعمرو بن صلاح اس طالب علم کو حلقہ میں بیٹھنے سے روک دیتے تھے جو عمامہ کے بغیر ٹوپی پہن کر آتا تھا۔

طالب علم اپنی کتابیں حلقہ میں کسی اونچی چیز جیسے رحل پر رکھیں ورنہ ہاتھوں میں لیے رہیں۔

کسی طالب علم سے اگر کوئی خلاف ادب بات سرزد ہوتی تو سوائے استاذ کے کسی دوسرے کو ٹوکنے کی اجازت نہ تھی۔

پھر حلقۂ درس میں وہ تمام آداب برتے جاتے تھے جو معاشرتی مجلسوں میں ملحوظ رکھے جاتے تھے، مثلاً جب حلقہ میں پہنچتے تو بلند آواز سے حاضرین کو سلام کرتے

(۱) تذکرۃ السامع ص ۳۱، ۱۵۰، ۱۵۱۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۹۰۔

حاضرین ایک دوسرے سے احترام سے پیش آتے تھے، ایک دوسرے کی تعظیم کرنے میں سبقت کرتے تھے، کسی کے آگے یا دو آدمی کے بیچ میں بیٹھنے سے احتراز کرتے تھے، جب کوئی حلقہ میں آتا تو خندہ جبینی سے اس کا استقبال کرتے، کسی دوسرے کی قرأت کے درمیان اسے ٹوکتے نہ تھے، اگر درس کے اثناء میں کسی سے گفتگو کرنی ہوتی تو استاذ سے اجازت لیتے تھے، کسی طالب علم سے کوئی بات ادب کے خلاف سرزد ہوتی، تو صرف استاذ اور مرتب اسے ٹوکتے، طالب علم ایک دوسرے کو ادب نہ سکھاتے، جو لوگ مجلس میں دیر سے پہنچتے وہ آخر میں بیٹھ رہتے، اگر کوئی اٹھ کر جاتا تو اس کی جگہ پر قبضہ نہ کرتے، اسے خالی چھوڑ دیتے، سن رسیدہ اور افضل طالب علموں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے اور انہیں موقع دیتے کہ وہ استاذوں کے قریب بیٹھیں، تاکہ ان کے سوال و جواب سے دوسروں کو فائدہ پہنچے بلکہ ایسے شاگردوں کو استاذ خود آگے بلا لیتے تھے، مثلاً امام احمد بن حنبل، شیخ ابو عاصم ضحاک بن مخلد کے درس کے حلقہ میں شریک ہوتے تھے، ایک مرتبہ وہ حلقہ میں دیر سے آئے تو جگہ پر ہو چکی تھی، شیخ نے انہیں دیکھ کر آگے بلایا لیکن انہوں نے لوگوں کی گردنیں پھاند کر جانے میں تامل کیا، تو شیخ نے حلقہ میں وسعت پیدا کرا کر ان کے لیے راستہ بنوایا اور وہ اس سے ہو کر شیخ کے قریب جا کر بیٹھے، درس کے شروع اور خاتمہ دونوں پر حمد و صلوٰت کے علاوہ شیخ اور کتاب کے مصنف کے لیے دعائے خیر کرتے تھے اور شیخ درس کے خاتمہ پر چند پند و نصائح کلمے طالب علموں سے کہتا تھا۔(۱)

خاتمۂ درس: قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں کو درس کے خاتمہ پر یہ دعائے ماثورہ سبحانك اللّٰهم بحمدك ولا اله الا انت استغفرك واتوب اليك فاغفرلی انه لا يغفر الذنوب الا انت پڑھنے کی ہدایت کی ہے اور بعض اساتذہ اپنے درس کا خاتمہ زہد و اخلاق کے چند پند و نصائح پر کرتے تھے، قاضی ابن جماعہ نے اساتذہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ درس ختم کر کے تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تاکہ طلبہ تہذیب اور شائستگی سے ان کے

(۱) تذکرۃ السامع ص ۳۹، ۹۳، ۹۶، ۱۰۸، وغیرہ۔

سامنے حلقہ سے نکلیں اور باہر نکلنے میں باہم کشمکش نہ ہو، اس کے علاوہ جو لوگ پیدل جانے والے ہوں وہ چلے جائیں، تاکہ یہ بدنمائی نہ ہو کہ استاذ سواری پر واپس جائے اور نادار طلبہ اور اس کے ہمعصر علما پیدل روانہ ہوں اور جب حلقۂ درس خالی ہو جائے تو استاذ اپنی جگہ سے اٹھے اور یہ دعا پڑھ کر روانہ ہو جائے۔

سبحانك اللّٰهم وبحمدك لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك ۔ (۱)

(۷)

طریقۂ تعلیم ونصاب درس

اسلامی مدرسوں اور درس کے حلقوں میں بڑے طلبہ کو نہ صرف علوم کے انتخاب کا اختیار حاصل تھا بلکہ انہیں اپنے استاذوں کے انتخاب کی بھی آزادی حاصل تھی، وہ جس استاذ کو پسند کرتے اس کے درس کے حلقہ میں شریک ہو کر تعلیم جاری رکھتے تھے۔

اساتذہ کا انتخاب: اساتذہ کا انتخاب میں انہیں چند امور کا مشورہ دیا جاتا تھا، مثلاً ان کا فرض تھا کہ وہ خود دقت نظر سے مختلف استاذوں کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے لیے کسی کو منتخب کریں، اس انتخاب میں اہل علم دوستوں اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کریں، اساتذہ کی علمی استعداد کے علاوہ ان کے زہد، تقویٰ اور اخلاق پر بھی نظر ڈالی جاتی تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ کن کن مشائخ کے حلقۂ درس سے فیضیاب ہوئے ہیں، اس لیے اساتذہ کے ذاتی کمالات کے علاوہ ان کے شیوخ کی منزلت سے بھی ان کی منزلت ہوتی تھی۔

استاذ کے انتخاب کے بعد کم سے کم دو مہینے اس کے درس میں شریک ہونا ضروری

(۱) تذکرۃ السامع ص ۳۷، ۴۴، ۴۵۔

قرار دیا گیا تھا، تا کہ اس اثناء میں اپنی تشفی کے متعلق صحیح اندازہ ہو سکے، اگر طبیعت کو سیری نہ ہوتی تو پھر اس حلقہ کو چھوڑ دیتے لیکن دو ماہ سے پہلے چھوڑنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے، کیوں کہ اس سے کم مدت میں کسی استاذ کے متعلق صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے۔(۱)

نوعمر طالب علموں کے لیے ان کے والدین اس فرض کو انجام دیتے تھے اور اس مسئلہ میں اپنے دوستوں اور بہی خواہوں سے مشورہ کرتے تھے، احمد بن سلمہ جو امام مسلم کے ساتھیوں میں سے تھے کہتے ہیں کہ ان کے والد نے انہیں قتیبہ کے درس کے حلقہ میں بھیجنے کے لیے اپنے بعض دوستوں کو صلاح و مشورہ کی خاطر کھانے پر مدعو کیا، کھانے کے بعد اس مسئلہ پر مشورہ کیا اور اس کے بعد انہیں قتیبہ کے درس کے حلقہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔(۲)

تعلیم کے ماہرین نے اساتذہ کے انتخاب کے مسئلہ میں اس کی ممانعت کی ہے کہ صرف کسی استاذ کی غیر معمولی شہرت سن کر اس کی طرف رجوع کیا جائے، اکثر غیر معروف معلمین اور اساتذہ بڑی جاں فشانی سے درس دیتے ہیں اور ان کے حلقہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا امکان ہوتا ہے۔(۳)

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے: بچوں کی تعلیم قرآن مجید کے درس سے شروع کراتے تھے، پہلے بچپن میں اسے پڑھا کر زبانی یاد کراتے، پھر قرآنی علوم طلبہ کے ذہن نشین کراتے تھے، اس کے بعد دوسرے فنون کی تعلیم دیتے تھے، قاضی ابن الجماعہ لکھتے ہیں:

> ”تعلیم کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی کتاب عزیز سے کرنا چاہیے، پہلے اسے حفظ کیا جائے پھر اس کی تفسیر اور دوسرے متعلق علوم میں مہارت پیدا کی جائے، کیوں کہ علم قرآن ہی تمام علوم کی بنیاد ہے اور اسے تمام علوم پر فضیلت و اہمیت حاصل ہے“۔(۴)

---

(۱) تعلیم المتعلم۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد۲ ص ۱۹۱۔ (۳) تذکرۃ السامع ص ۸۵، ۸۶ و تعلیم المتعلم ص ۱۷ تا ۲۲۔ (۴) تذکرۃ السامع ص ۱۱۲، ۱۱۳۔

ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ جو مختلف علوم میں بحر زخار تھے، فرماتے ہیں:

''مجھے میرے والد نے اس وقت تک حدیث پڑھنے کی اجازت نہیں دی، جب تک میں نے قرآن مجید کو فضل بن شاذان سے ختم نہ کرلیا''۔(۱)

ابن خلکان کا بیان ہے کہ:

''رئیس ابوعلی ابن سینا دس سال کی عمر میں علم قرآن کا ماہر ہو چکا تھا''۔(۲)

ہندوستان کے علما کے سوانح میں بھی اس کی تصریح ملتی ہے کہ یہاں بھی پہلے قرآن مجید پڑھاتے، اس کے بعد دوسرے علوم شروع کراتے تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنے متعلق لکھتے ہیں:

''اول از قرآن مجید بسابقہ تعلیم فرمودند، سبق در سبق ایشاں می نوشتند، ومن میخوانم''۔(۳)

ابتداً بچوں کی تعلیم قرآن مجید سے شروع اور اسے ختم کرائے بغیر کسی دوسرے علم کے شروع نہ کرنے کا رواج تھا، مگر آگے چل کر اس طرز عمل میں کسی قدر تبدیلی پیدا ہوئی، تعلیم کی ابتدا تو قرآن مجید ہی سے کراتے لیکن بعض ملکوں میں اس کے ساتھ دوسرے علوم بھی شروع کرا دیتے تھے، ابن خلدون نے مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم کو بیان کیا ہے، جسے مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے اپنے مقدمہ التربیۃ الاستقلالیہ میں نقل کیا ہے، اس کا اقتباس ذیل میں پیش ہے، اس سے مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم کا فرق ظاہر ہوگا لکھتا ہے:

''اہل مغرب بچوں کو ابتدا میں صرف قرآن پاک کی تعلیم دیتے تھے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے علم مثلاً حدیث، فقہ اور شعر وغیرہ کو نہیں ملاتے تھے، بربر بھی ان ہی کے مقلد تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اور لوگوں سے زیادہ قرآن مجید کے حافظ ہوتے ہیں''۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد۳ ص۲۲۸۔ (۲) وفیات الاعیان جلد۱ ص۱۹۱۔ (۳) اخبار الاخیار ص۲۹۱۔

''اہل اندلس کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن پاک کے ساتھ شعر، انشا پردازی، قواعد عربیت اور تجوید خط کی بھی تعلیم دیتے تھے اور تجوید خط کا سب سے زیادہ لحاظ رکھتے تھے''۔

''اہل افریقہ بھی اگر چہ قرآن پاک کی تعلیم کے ساتھ حدیث اور بعض دوسرے علوم کی تعلیم ملا لیتے تھے لیکن قرآن مجید اور اس کے وجوہ قرأت کے ساتھ ان کو سب سے زیادہ اعتنا تھا اور تجوید خط ایک ضمنی چیز تھی، انہوں نے یہ طریقۂ تعلیم اہل اندلس سے سیکھا تھا، اس لیے یہ اہل اندلس کے طریقۂ تعلیم سے زیادہ مشابہ تھے''۔

''اہل مشرق بھی قرآن مجید کے ساتھ اور علوم کی تعلیم دیتے تھے لیکن تجوید خط کے ساتھ ان کو خاص اعتنا تھا، اس کے الگ قواعد مقرر تھے، الگ معلم ہوتے تھے، مستقل طور پر اور صنعتوں کی طرح اس کی تعلیم بھی دیتے تھے اور مکاتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس کی تکمیل کی جاتی تھی''۔

''طریقۂ تعلیم کے اس اختلاف کے نتائج بھی مختلف ہوتے تھے، مثلاً اہل مغرب اور اہل افریقہ نے چوں کہ اپنی تمام تر توجہ قرآن پاک کی طرف مبذول کر دی تھی، اس لیے ان میں کسی علم کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا، کیوں کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کے بیان کے اسلوب کا تتبع انسانی قدرت سے باہر ہے، اس لیے ان میں اس تعلیم سے عربیت کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا''۔

''البتہ اہل افریقہ نے چوں کہ اس کے ساتھ اور علوم بھی ملائے تھے، اس لیے ان میں انشا پردازی کا ملکہ کسی قدر پیدا ہو جاتا تھا''۔

''لیکن اہل اندلس نے چوں کہ تعلیم قرآن کے ساتھ شعر، انشا پردازی اور عربیت کی تعلیم کو بھی ملایا تھا، اس لیے ان میں ادب اور لٹریچر کا نہایت عمدہ ملکہ

پیدا ہو جاتا تھا"۔(۱)

ہندوستان میں بھی قرآن مجید پڑھاتے پھر لکھنا سکھاتے، اس کے بعد ہر فن کی مختصر کتابیں مثل کافیہ، لب الالباب، ارشاد وغیرہ پڑھاتے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے تحصیل علم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"اول از قرآن مجید متسابقۃً تعلیم فرمودند، سبق در سبق ایشاں می نوشتند، و من می خواندم از قرآن ہمیں مقدار تعلیم کردہ ام، بعد ازاں باثر تربیت وشفقت ایشاں چناں قوت بہم رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم، و ہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشاں می گذرانیدم در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم"۔

"و در خط وسواد چنانچہ معلمان صبیانی اطفال را در مکتبہا یاد دہند مفید نہ شدند، فقیر را تا وقاف بر طریقۂ اطفال مفید شدہ نویسانیدہ باشند، بعد ازاں بطریق اجمال در اندک مدت شاید اگر مقدار یک ماہ تعین کنیم، دروغ نگفتہ باشم، قدرت کتابت وسلیقہ انشا پیدا شد"۔

پھر ابتدائی تعلیم کی تفصیل بیان کر کے لکھتے ہیں:

"می فرمودند تو یک مختصر از ہر علم بخواں ترا پسندیدہ است بعد ازاں انشاء اللہ چناں ابواب برکت وسعادت بر تو کشاید، کہ جمیع علوم بے تکلف تحصیل روے نماید"۔(۲)

ہر فن کی اہم کتابوں کو زبانی یاد کرنا: قرآن مجید کی تعلیم کے بعد دوسرے علوم شروع کرائے جاتے تھے اور سب سے پہلے اہم علوم حدیث، اصول، صرف ونحو کے اہم مسائل اور مبادیات طلبہ کو حفظ کرا دیے جاتے تھے اور اس کے ساتھ علم قرآن میں بصیرت پیدا

(۱) مقدمة التربية الاستقلالية بحواله مقدمه ابن خلدون ص ۶۱۶، ۶۱۷، ابن خلدون کی بعض عبارتوں کے ترجمے بھی مقدمہ التربیۃ الاستقلالیہ سے منقول ہیں۔ (۲) اخبار الاخبار ص ۲۹۰، ۲۹۱۔

کرنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔(۱)

معیاری کتابوں کے حفظ کے لیے سلاطین اسلام کے انعامات: علوم کے مبادی کے حفظ کرنے کا طریقہ بڑی پابندی سے رائج تھا اور طالب علموں کی تعلیمی بنیاد کی استواری کے لیے یہ بے حد ضروری سمجھا جاتا تھا، اسی وجہ سے سلاطین اور امرا نے طلبہ کی ہمت بڑھانے اور شوق دلانے کے لیے مختلف معیاری کتابوں کے برزبان کرنے کے لیے مستقل گراں قدر انعامات مقرر کر دیے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ ان کتابوں کے برزبان کرنے میں سبقت کرتے تھے، چنانچہ مصر کے بعض سلاطین نے امام محمد کی مشہور تصنیفات پر جو فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں ہیں گراں قدر انعامات مقرر کیے تھے۔(۲)

حفظ کا طریقہ: اساتذہ طالب علموں کو حفظ کرنے کے طریقے بتاتے تھے، زرنوجی طلبہ کو ہدایت کرتا ہے کہ:

> ''طالب علم کو چاہیے کہ وہ دل میں سبق کے بار بار دہرانے کا شمار کرتا جائے، آج کا سبق برزبان کر لینے کے بعد کل کے سبق کو پانچ مرتبہ، پرسوں کے سبق کو چار مرتبہ، ترسوں کا تین مرتبہ، اس سے پہلے کا دو اور اس سے بھی پہلے کا ایک مرتبہ پابندی سے دہرائے، یہ طریقہ برزبان رکھنے کا سب سے بہتر ہے''۔(۳)

حفظ اخبار وسیر: طلبہ کو جو چیزیں حفظ کرائی جاتی تھیں، ان میں صحابہ، تابعین، خلفا، ائمۂ اسلام، صالحین اور مشہور فقہا کے نام اور ان کے مختصر حالات وسوانح بھی تھے، یہ انہیں املا کرا کر یاد کرائے جاتے تھے تاکہ وہ علم اور مذہب کے ستونوں سے باخبر رہیں لیکن ان اکابر کی ایک دوسرے پر باہمی فضیلت وغیرہ اختلافی مسئلوں پر مدرسہ میں بحث اور مناظرہ کی اجازت نہ تھی۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۱۳۔ (۲) الدرر الکامنہ ابن حجر۔ (۳) تعلیم المتعلم ص ۴۸۔ (۴) تذکرۃ السامع ص ۵۸۔

حفظ کتب: چنانچہ اسلامی مدرسوں کے طالب علم مختلف علوم وفنون کی چیزیں بہ کثرت حفظ کرتے تھے، ابن خلکان ابوعلی بن سینا کے متعلق لکھتا ہے:

''اس نے اصول دین، ہندوستانی حساب اور جبر ومقابلہ کی چند چیزیں حفظ کیں''۔(۱)

علامہ ذہبی فقیہ یونینی کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے طالب علمی کے زمانہ میں پہلے قرآن یاد کیا، پھر لکھنا سیکھا، پھر حمیدی کی الجمع بین الصحیحین یاد کی، پھر چار مہینے میں صحیح مسلم برزبان کی اوران کے جلد یاد کر لینے کی مثال یہ ہے کہ انہوں نے سورۂ انعام صرف ایک دن میں یاد کیا اور حریری کے تین مقامات ایک دن کے صرف بعض حصوں میں (۲) امام بخاری نے ۱۱سال کی عمر میں علم حدیث کی تحصیل شروع کی اور ابن مبارک کی کتابیں بچپن ہی میں یاد کر لیں۔(۳)

ابوبکر بن انباری نحوی کے متعلق ان کے شاگرد ابوعلی قالی کا بیان ہے کہ کہا جاتا ہے کہ انہیں تین لاکھ اشعار صرف ایسے یاد تھے جو قرآن مجید کی شہادت میں پیش کیے جاسکتے تھے۔(۴)

سیوطی ابن قتیبہ کے صاحبزادے ابوجعفر احمد قاضی مصر متوفی ۳۲۲ھ کے متعلق لکھتا ہے کہ:

''یہ علم اور حفظ والوں میں سے تھے، انہوں نے مصر میں اپنے والد کی تمام کتابیں اپنے حفظ سے تلامذہ کو پڑھ کر سنائیں، ان کے ساتھ کوئی کتاب نہ تھی اور ابن قتیبہ کی کتابیں تعداد میں اکیس تھیں''۔(۵)

ہندوستان کے اہل علم میں حفظ کا رواج: ہندوستان کے اہل علم میں بھی کتابیں حفظ

(۱) وفیات الاعیان جلد ا ص ۱۹۱۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۳۴۔ (۳) ایضاً جلد ۲ ص ۱۳۴۔ (۴) ایضاً جلد ۳ ص ۵۷۔ (۵) حسن المحاضرہ جلد ا ص ۱۵۶۔

کر لینے کا رواج تھا، شیخ عثمان ابن داؤد ملتانی متوفی ۷۳۶ھ کے متعلق سیر الاولیا کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں ہے:

''انہیں فقہ میں ہدایہ اصول میں بزودی اور قوت القلوب مکی اور احیاء العلوم غزالی سلوک وتصوف میں برزبان یاد تھیں''۔(۱)

بابا داؤد کشمیری متوفی ۱۰۹۷ء کو مشکوٰۃ برزبان یاد تھی، اسی نسبت سے مشکوٰتی مشہور ہوئے، تذکرہ علمائے ہند میں ہے:

''حافظ مشکوٰۃ المصابیح بود، بدین وجہ اورا مشکوٰتی می گفتند''۔(۲)

محدثین کا حفظِ حدیث: علم حدیث کے طالب علم غیر معمولی طور پر حدیثیں برزبان کرتے تھے، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ:

''میں نے ہر وہ چیز برزبان کر لی جو ہشیم سے ان کی زندگی میں سنی تھی''۔(۳)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مکہ جا رہا تھا، راستہ میں ایک شیخ سے ملاقات ہوئی، ان کی روایتیں ایک دوسری سند سے میں نے حاصل کی تھیں، جو دو جزوں میں لکھی ہوئی تھیں، میں نے خیال کیا کہ یہ دونوں جز ساتھ موجود ہیں، انہیں شیخ سے پڑھ لوں، چنانچہ میں نے ان سے استدعا کی اور وہ سنانے پر آمادہ ہو گئے، اب میں اپنے جز نکالتا ہوں، تو سادے صفحات تھے میں ان ہی کو ہاتھ میں لے کر سننے لگا اور شیخ اپنی حدیثیں سناتے گئے، اتفاق سے ان کی نظر سادے صفحوں پر پڑ گئی اور انہوں نے برہمی سے کہا تمہیں شرم نہیں آتی میں نے کہا، ابھی جو حدیثیں آپ نے روایت کیں وہ مجھے یاد ہو گئیں، انہیں یقین نہیں آیا اور خیال ہوا کہ وہ پہلے سے یاد ہوں گی، میں نے کہا دوسری روایتیں سنائیے، میں سنا دوں گا، چنانچہ انہوں نے چالیس روایتیں سنائیں اور ان کے سوال پر میں نے سب انہیں اسی وقت دہرا دیں، کہیں ایک حرف کی بھی

(۱) نزہۃ الخواطر، ص ۱۷۶۔ (۲) تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۰۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۷۔

غلطی نہیں ہوئی۔(۱)

داؤد بن یحییٰ حافظ ابوعبداللہ محمد بن علی قرطمہ کے متعلق کہتے ہیں:

''لوگ حفظ میں ابوزرعہ اور ابوحاتم کا نام لیتے ہیں، واللہ میں نے قرطمہ سے زیادہ کسی کو حافظ نہیں پایا، میں ایک مرتبہ ان کے یہاں گیا، انہوں نے کہا یہ کتابیں رکھی ہیں، ان میں سے کوئی اٹھا لو اور میں پوری زبانی پڑھ دوں، میں نے کتاب الاشربہ اٹھائی اور انہوں نے اول سے آخر تک اسے سناڈالا''۔(۲)

امام شعبی فرماتے ہیں کہ ''مجھ سے جب کسی شخص نے حدیث بیان کی تو اس کو میں نے حفظ کرلیا، میں جو کچھ سنتا ہوں اسے حفظ کرلیتا ہوں''۔(۳)

امام عجلی سے پوچھا گیا کہ کیا ان کے پاس حدیثوں کے مجموعہ کی کوئی کتاب موجود ہے؟ تو انہوں نے فرمایا ''میرا سفینہ میرا سینہ ہی ہے'' وہ بصرہ میں اپنے وقت کے حدیث کے سب سے بڑے حافظ تھے۔(۴)

اسباق میں طلبہ کی ذہنی استعداد کا لحاظ: مبتدیوں کو اتنا سبق دیا جاتا جتنا وہ یاد کر سکتے تھے، زرنوجی اپنے مشائخ کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ ''مبتدیوں کو بس اس قدر سبق دینا چاہیے، جسے وہ دو مرتبہ کے اعادہ سے یاد کرلیں''۔(۵)

اس کے بعد جیسے جیسے طالب علم کی استعداد بڑھتی اسباق تدریجی طور پر بڑھاتے جاتے تھے، کسی طالب علم کو اس وقت تک کوئی چیز لکھنے کی اجازت نہ تھی، جب تک وہ اسے اچھی طرح ذہن نشین نہ کرلے، جب نئے طلبہ حلقہ میں آتے تو شیخ ان کی ذہنی استعداد کا امتحان لیتا، ماہرین تعلیم نے اس کی ہدایت کی ہے۔(۶)

علوم کی تعلیم میں یہ بھی ضروری سمجھا جاتا تھا کہ ایک فن میں مہارت حاصل کرنے

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد۲ص ۲۰۹۔(۲) ایضاً ص ۳۰۹۔(۳) طبقات الشافعیہ سبکی جلد۱ص ۲۴۴۔(۴) تذکرۃ الحفاظ جلد۳ص ۳۱۔(۵) تعلیم المتعلم ص۴۰ وتذکرۃ السامع ص ۵۲۔(۶) تذکرۃ السامع۔

کے بعد دوسرے کو شروع کیا جائے، امام غزالی اور ابن خلدون نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔(۱)

طرزِ تعلیم: علامہ شبلیؒ اسلامی نظام تعلیم کے دور اول میں طرز تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

"اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے، یعنی املا جس کو اردو میں لکچر دینا کہتے ہیں، استاذ ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا، طالب علم جو ہمیشہ دوات وقلم لے کر بیٹھتے تھے، ان تحقیقات کو استاذ کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے، اس طرح پر ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی، امالی ابن درید اور ثعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہیں، جب معمول سے زیادہ طلبہ حلقۂ درس میں جمع ہوتے تھے تو استاذ کے سامنے دائیں بائیں چند فاضل کھڑے ہوتے تھے جو دور والوں کو استاذ کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے، یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے، یہ طریقۂ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، ابوبشر متی جو بغداد میں ارسطو کی کتاب المنطق کا درس دیتا تھا، اس کے لکچر میں سینکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے، جن میں فارابی بھی تھا اور اس نے کئی سو صفحے خود نقل کیے تھے"۔(۲)

طلبہ املا وسماع کے وقت پورے طور پر متوجہ رہتے تھے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی مسئلہ میں لگ جاتے تو بھی توجہ ادھر سے نہ ہٹتی، امام دارقطنی کی طالب علمی کے زمانہ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ وہ اپنی کم سنی کے زمانہ میں اسماعیل صفار کی مجلس میں حاضر تھے، صفار حدیثیں سناتے جاتے اور سماع میں شریک ہونے کے باوجود کوئی دوسری چیز لکھتے جاتے تھے، یہ دیکھ کر ایک ساتھی نے جھنجھلا کر کہا تم لکھنے میں مصروف ہو تمہارا سماع جائز نہ ہوگا،

(۱) احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۴۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۵۶۔

دار قطنی کو بھی طیش آیا اور انھوں نے کہا املا کے لیے میری سمجھ تمہاری سمجھ سے مختلف ہے، کیا تمھیں یاد ہے کہ شیخ نے کس قدر املا کرایا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا، تو دار قطنی نے تفصیل بیان کرنی شروع کی کہ اٹھارہ حدیثیں لکھا چکے ہیں، پہلی حدیث عن فلاں عن فلاں تھی اور اس کا متن یہ اور یہ تھا، دوسری حدیث عن فلاں عن فلاں ہے اور اس کا متن یہ اور یہ ہے، اسی طریقہ سے اس وقت کی لکھائی ہوئی کل حدیثیں زبانی سنا دیں، یہ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی۔(۱)

جب درس کے حلقہ میں مقرر کتابیں پڑھانے کا دستور ہوا تو اس کے دو طریقے رائج تھے، بعض مرتبہ اساتذہ کتابوں کی قرأت کرتے تھے اور شاگرد انہیں سنتے تھے اور بعض حلقوں میں استاذ کے سامنے کتابوں کی قرأت شاگرد کرتے تھے اور استاذ انہیں سنتا اور حسب ضرورت غلطی کے موقعوں پر ان کی تصحیح کرتا اور مشکل مقاموں پر شبہے دور کرتا۔

سندیں: ان مختلف طریقوں سے حاصل کیے ہوئے علم کی سندوں میں اعتبار اور استناد کے لحاظ سے درجے اور امتیاز قائم تھے اور اسی لحاظ سے سندیں دی جاتی تھیں اور ان سندوں کی مختلف قسمیں تھیں، مثلاً ایک قسم کی سند اصطلاحاً ''اجازۃ'' کہلاتی تھی، یعنی شیوخ اپنے کسی شاگرد کو کسی کتاب کا کچھ حصہ پڑھا دیتے اور اس کے باقی حصوں کے پڑھنے کی اجازت اپنے کسی ایسے شاگرد کو دیتے، جسے وہ پہلے پڑھا کر سند دے چکے ہوتے، یا اس طالب علم کو خود بغیر کچھ پڑھائے ہوئے اپنے شاگردوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دے کر اپنے کسی شاگرد سے اپنی کتاب کے پڑھنے کی اجازت دے دیتے تھے، اب وہ طالب علم پہلے فارغ التحصیل شاگرد سے اس کتاب کی ''اجازت'' کے طریق پر سند قرأت لیتا، جیسے اما شافعی کے سامنے ان کے ایک شاگرد زعفرانی نے کتاب الام بجز کتاب الصلوٰۃ والمناسک کے پوری پڑھی اور کتاب الصلوٰۃ اور کتاب المناسک خود امام شافعی نے

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۰۰۔

ان کے سامنے پڑھ دیں، اس کے بعد امام شافعی بغداد پہنچے، یہاں ایک دوسرے اہل علم کرابیسی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کتاب الام کی کتابیں (ابواب) پڑھنی چاہیں لیکن امام شافعی نے ان سے فرمایا کہ میں زعفرانی کو کتابیں دے چکا ہوں، ان سے حاصل کرلو، میں تمہیں ان سے پڑھنے کی سند اجازۃ دیتا ہوں۔(۱)

طریق سماع واجازۃ وقرأت کے فرقوں کا اندازۃ حافظ ابن المفضل کے ذیل کے بیان سے ہوگا، وہ فرماتے ہیں:

"میں نے سلفی سے پوری صحیح بطریق اجازہ بذریعہ ابومکتوم ابن ابی ذرسنی اور ہمارے شیخ ابوعبید احمد بن زیادۃ اللہ غفاری نے مکہ میں ابومکتوم سے سنا تھا، تو میں نے ان سے اکثر حصہ سن لیا اور بقیہ حصہ کی انہوں نے اجازت دے دی، ابومکتوم کے واسطے سے سب سے آخر میں جس نے روایت کی ہے، وہ ابوالحسن علی بن حمید بن عمار انصاری ہیں، انہوں نے بطریق اجازۃ حاصل کیا تھا اور میں نے پوری کتاب اپنے استاذ ابوطالب صالح بن سند سے پڑھی، جنہوں نے اس کو طرطوسی سے اور طرطوسی نے ابوالولید باجی سے سنا تھا"۔(۲)

کتابوں کی سند واجازہ میں یہ ضروری تھا کہ شیخ اپنے شیوخ کے واسطوں سے اپنی قرأت وسماع کا سلسلہ اس کتاب کے مصنف تک پہنچائے، ورنہ وہ سند لائق اعتبار نہ سمجھی جاتی تھی، ایسی سندیں آج بھی عربی مدرسوں میں رائج ہیں۔

نصاب تعلیم: اسلامی نظام تعلیم میں علوم قرآن، تفسیر، حدیث، اصول، اصول فقہ، وکلام اور مناظرہ وغیرہ کی تحصیل مدرسہ کے ہر طالب علم کے لیے لازمی تھی اور طالب علموں کے اسباق میں اسی ترتیب بالا سے انہیں پہلے اور پیچھے جگہ دی جاتی تھی، ان کے علاوہ دیگر علوم حساب، ہیئت، طب، نجوم اور زراعت وغیرہ کی تحصیل اختیاری قرار دی گئی تھی، جس طالب

(۱) طبقات الشافعیہ جلد ا ص ۲۵۰۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۸۶۔

علم کو جس علم سے مناسبت ہوتی ہو اس کی طرف رجوع کرتا تھا اور اسی لیے ان علوم کی تحصیل مذہبی اصطلاح میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، فرض کفایہ سمجھی جاتی تھی (۱) اس کے ساتھ مختلف علوم وفنون کے معلم اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ وہ طالب علموں کے دلوں میں کسی خاص فن کی طرف سے حقارت کا جذبہ پیدا نہ کریں، مثلاً فقہ کا معلم علم لغت کی برائیاں نہ کرتا یا تفسیر اور حدیث کی تعلیم دینے والا علم فقہ کو ہلکہ کر کے نہ دکھاتا تھا۔

تعلیم کے طریقہ میں یہ بات لائق ذکر ہے کہ علوم وفنون کی تعلیم میں اساتذہ اصل مطمح نظر اپنے فن کے اصل قواعد اور اصول طالب علموں کو اس طرح ذہن نشین کرا دیتے تھے کہ انہیں فن میں حقیقی بصیرت حاصل ہو اور وہ خود سے ان کے دوسرے مسائل ان پر قیاس کر سکیں۔ (۲)

طلبہ کے روزانہ کے اسباق کی ایک مثال: طالب علموں کے ذمہ روزانہ بہت سے اسباق رہتے تھے، علامہ ذہبی نے امام نووی کے روزانہ کے اسباق کی فہرست حسب ذیل درج کی ہے، وہ یہ ہے، ۱۔الوسیط ۲۔الوسیط (دو سبق) ۳۔کتاب المہذب ۴۔الجمع بین الصحیحین حمیدی ۵۔صحیح مسلم ۶۔کتاب اللمع ابن جنی ۷۔اصلاح منطق ۸۔تصریف ۹۔اصول ۱۰۔اسمائے رجال ۱۱۔اصول دین۔

امام نووی ان گیارہوں سبقوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ان کے تمام متعلقات، مشکلات کی شرح عبارت کی توضیح اور لغتوں کے معنیٰ وغیرہ روزانہ لکھتے بھی تھے۔

بقدرِ استطاعت اسباق میں کمی کرنا: اگر تعلیم کا بوجھ کسی پر زیادہ ہو جاتا تھا تو وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس میں کمی کر دیتا تھا، چنانچہ امام نووی کو ان اسباق کی موجودگی میں طب پڑھنے کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے کتاب قانون خریدی، مگر وہ اس بوجھ کو سنبھال نہ سکے اور علم طب کی تحصیل کا ارادہ ترک کر کے وہ کتاب فروخت کر ڈالی۔ (۳)

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۳۵، ۳۶۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۵۸، ۱۱۸۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۵۱۔

فنِ حدیث کی درسی کتابیں: ہر فن کی تعلیم کے لیے اس عہد کی تک تصنیف کی ہوئی معیاری کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، مثال کے طور پر فن حدیث کی درسیات ذیل میں پیش ہیں۔

فنِ حدیث کی تحصیل کے معنیٰ حدیث کے اسناد، رجال، معنیٰ، لغت اور تاریخ پر عبور حاصل کرنے کے تھے۔

علم حدیث کا جو کم سے کم نصاب مقرر تھا، اس میں پہلے صحیح بخاری پڑھاتے تھے، پھر صحیح مسلم، اس کے بعد مشہور کتابیں موطا امام مالک، سنن ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ، جامع ترمذی، مسند شافعی (واحناف کو موطائے محمد) لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھیں۔(۱)

خصوصاً صحاح ستہ میں سے کوئی کتاب چھوڑی نہ جاتی تھی، چنانچہ اکثر محدثین کے حالات میں ان کے پڑھنے کا ذکر آتا ہے، مثلاً امام نووی کے حالات میں علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

"کتب ستہ (صحیح بخاری، مسلم سنن ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند ابن حنبل، موطا، شرح السنہ بغوی، سنن دار قطنی اور بہت سی کتابیں سنیں"۔(۲)

ان صحاح وسنن کی قرأت اور سماع کے بعد علم حدیث میں بصیرت پیدا کرنے کے لیے سنن بیہقی اور مسند احمد بن حنبل، ابن حمید و بزاز وغیرہ پڑھتے تھے، کسی محدث کے لیے ان مذکورۂ بالا صحاح، سنن اور مسانید سے کم پر اکتفا کرنے کی اجازت نہ تھی (۳) اسی کے ساتھ اصول حدیث میں چند کتابیں لازمی تھیں، مثلاً کتاب العلل دار قطنی، کتاب المؤتلف والمختلف امیر ابونصر بن ماکولا کتاب وفیات الشیوخ حمیدی اور معرفۃ علوم الحدیث حاکم۔(۴)

پھر جو لوگ علم حدیث میں اعلیٰ بصیرت پیدا کرنی چاہتے تھے، وہ اس زمانہ میں بھی حدیث کی طلب کے لیے سفر کرکے ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے تھے اور مختلف محدثین سے کتابیں اور روایتیں پڑھتے اور سنتے تھے، مثلاً ابن عساکر ابواسحاق ابراہیم بن احمد

---

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۲۷ تا ۱۲۹۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد۴ ص ۲۵۱۔ (۳) تذکرۃ السامع ص ۱۲۹۔

(۴) وفیات الاعیان جلد ا ص ۶۱۴۔

نیشا پوری ان کے متعلق لکھتا ہے "کبر سنی میں علم حدیث حاصل کیا، نیشا پور میں روایتیں سنیں پھر نساء گئے، جہاں حسن بن سفیان سے مسند ابن مبارک اور مسند ابن ابی شیبہ اور انتخاب ابوبکر بن علی سنی"۔(۱)

اسی طرح اس زمانہ کے بہت سے اہل علم کے سوانح میں ایک شہر سے دوسرے شہر کو جا کر حدیثیں سننے کے حالات تذکرۃ الحفاظ ذہبی، ابن عساکر، ابن خلکان، الدرر الکامنہ ابن حجر اور شذرات الذہب ابن عماد حنبلی میں پائے جاتے ہیں۔

فنِ حدیث کی معیاری تحصیل: فن حدیث کی معیاری تحصیل اور "محدث" کا لقب پانے کے لیے چند امور ضروری سمجھے جاتے تھے۔

۱۔ صحیح احادیث کا معتد بہ حصہ بر زبان ہو۔

۲۔ حدیث کے جملہ اقسام صحیح، حسن، ضعیف و مرسل و مسند وغیرہ پر کامل عبور ہو۔

۳۔ علم درایت سے پوری آگاہی ہو، یعنی حدیث کے الفاظ اور معانی پر اس حیثیت سے کامل نظر ہو کہ وہ عربی قواعد اور شرعی ضوابط کے لحاظ سے واقعی قول رسول ﷺ معلوم ہو، چنانچہ ابن جماعہ محدث کی تعریف میں فرماتے ہیں:

"محدث وہ ہے جو اسانید و علل و اسمائے رجال پر جاری ہو، متون حدیث نوک زبان ہوں اور کتابوں میں سے صحاح ستہ، مسند احمد، سنن بیہقی اور معجم طبرانی کم سے کم سن چکا ہو"۔(۲)

دیگر علوم کی درسیات: جس طریقہ سے علم حدیث کی یہ کتابیں مقرر تھیں، اسی طریقہ سے دوسرے شرعی، ادبی اور عقلی علوم کا نصاب بھی مقرر تھا، ان علوم میں بھی اسی طریقہ سے مثلاً پہلے اشعار و دواوین یاد کراتے، صرف ونحو کے اہم مسائل ذہن نشین کراتے اور ادب وشعر میں ملکہ پیدا کرتے تھے، عقلیات میں بھی پہلے مبادیات حفظ کرتے، پھر کتابیں پڑھتے،

(۱) ابن عساکر۔ (۲) مفتاح السعادۃ جلد۲ ص۳ بحوالہ طبقات الشافعیہ سبکی۔

ان کی شرحوں سے گذرتے اور علوم سائنس میں بھی مبادیات کی تحصیل کے بعد عملی طور پر سائنٹفک تجربے کرتے اور ایجادات اور اکتشافات میں لگے رہتے تھے۔

مثلاً ابن ابی اصیبعہ اپنے چچا رشید الدین علی بن خلیفہ طبیب کی تحصیل علم کی تفصیل بیان کرتا ہے کہ "انہوں نے پہلے ابوالتقی صالح بن احمد قرشی مقدسی سے جو بچوں کو تعلیم دینے میں ماہر تھے، قرآن مجید حفظ کیا، پھر علم حساب پڑھا، پھر جمال الدین بن ابی الحواضر کی خدمت سے وابستہ ہو کر علم طب کی تحصیل شروع کی اور جالینوس کی کتابیں پڑھیں اور اس فن کے مبادیات حفظ کیے، پھر اطبا کی جماعت میں حاضر رہنے لگے اور بیمارستان میں عملی تجربہ اور امراض کی قسموں کی تعلیم حاصل کرتے رہے اور علاج و معالجہ کا طریقہ سیکھتے رہے، پھر اسی اثنا میں علم امراض چشم کی تعلیم حاصل کی اور قاضی نفیس الدین ابن زبیر سے جو بیمارستان کے شعبۂ چشم کے افسر اعلیٰ تھے، اس فن کو عملی حیثیت سے سیکھا، پھر اسی طرح آپریشن کرنے کی تعلیم اور مشق بہم پہنچائی اور نیز دوسرے علوم کی مہارت کے لیے موفق الدین عبداللطیف بن یوسف بغدادی اور سدید الدین منطقی سے سلسلۂ تعلیم جاری کیا اور ان سے ادب، فلسفہ اور منطق کی تحصیل کی، نیز علوم نجوم کی تحصیل ابومحمد بن جعدی سے کی اور فن موسیقی کی تعلیم ابن دیکبور مصری سے پائی اور بیس سال کی عمر میں ان تمام علوم وفنون میں مہارت حاصل کر لی اور شام پہنچ کر مطب شروع کر دیا، اس کے بعد پانچ سال مزید تحصیل میں صرف کیے اور پچیس سال کی عمر میں ماہر کامل بن گئے۔(۱)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے تحصیل علم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں طلبہ کس ترتیب سے پڑھتے، نصاب کی کتابوں اور ان کے حواشی و شروح کے متعلق کیا سمجھتے تھے، تعلیم کی مدت کیا تھی اور تعلیم میں اصل مطمح نظر کیا رہتا تھا اور تعلیم و تعلم کا کیا طریقہ رائج تھا، فرماتے ہیں:

(۱) عیون الانباء جلد ۲ ص ۲۴۷، ۲۴۸۔

''اول از قرآن مجید متسابقہ تعلیم فرمودند، سبق در سبق ایشاں می نوشتند، و من می خواندم از قرآن ہمیں مقدار تعلیم کردہ ام، بعدازاں باثر تربیت وشفقت ایشاں چناں قوت بہم رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم و ہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشاں می گذرانیدم، در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم''۔

''و در خط سواد چنانچہ معلمان جلیل اطفال را در مکتبہا یاد دہند، مفید نشدند، فقیر را تا فا و قاف بر طریقۂ اطفال مفید شدہ نویسانیدہ باشند بعدازاں بطریق اجمال دراندک مدت شاید اگر مقدار یک ماہ تعین کنیم در روغ نگفتہ باشم قدرت کتابت وسلیقۂ انشا پیدا شد''۔

''واز کتاب ہائے نظم واشعار کہ تعلم آن متعارف ایں دیار است شاید کہ چند چیز جزواز بوستاں و گلستاں و دیوان حافظ تعلیم کردہ باشند، وہم از ابتدا حالت صغر بعد از ختم قرآن میزان صرف یاد دادند، تا مصباح و کافیہ خود تعلیم فرمودند.... و گاہے کتابہا را تعدادی کردند و می فرمودند، ہمیں چند کتاب را کہ خواندی دانشمند شدی''۔

''می فرمودند تو یک مختصر از ہر علم بخواں تر اپسندیدہ ست، بعدازاں انشاء اللہ چناں ابواب برکت وسعادت برتو بکشاید، کہ جمیع علوم بے تکلف تحصیل روے نماید.....از مختصرات نحو مثل کافیہ، ولب وارشاد، شاید کہ در بعضے اوقات یک یک جزو بلکہ بیشتر طے می نمودم بلکہ بہ سبب حرص وشوقیکہ براتمام تحصیل وفراغ داشتم، چناں بودم کہ اگر جزوے ازیں مختصرات مصحح ومحشی بدست می افتاد، بگذرانیدن آں پیش استاذ نمی پرداختم، وبجملی از مطالعہ کہ دران اوان بنظر در حواشی دست می داد اکتفا کردہ، بجزو دیگری انداختم....مفید نہ بودم، کہ شروع از اول کتاب باید نمود، واختتام بآخران کردم مطمح نظر تحصیل علم بود، ہر نوع کہ باشد دوازدہ یا سیزدہ

سالہ بودہ ام کہ شرح شمسیہ وشرح عقائد می خواندم و پانزدہ یا شانزدہ کہ مطول ومختصر را گذراندم وپیشتر بیک سال از عددے کہ ظرفا درشمار عمراز ذکران ملاحظہ کنداز علوم عقلی ونقلی آنچہ درافادہ واستفادہ ازصورت ومادہ کافی ووافی باشد تمام کردم....وبالجملہ ہمیں قیاس کہ برخواندم برسائر کتب عبوری کردم وعثوری نمودم، غیرآنکہ مدت ہفت ہشت سال بلکہ زیادہ بعداز رسیدن بکتب عربیت ومنطق وکلام وحصول نوعے ازقوت اکمال واتمام ملازمت درس بعضی از دانشمندان ماوراءالنہر بطورے نمودہ شد کہ درتمامی شب وروز شاید کہ دوسہ ساعت ازمطالعہ وتعقل واشتغال فرصتے دست نمی دادہ باشند''۔(۱)

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے رسالہ وصیت نامہ میں تعلیم کے طریقہ اور کتابوں کی ترتیب پر خیالات ظاہر کیے ہیں، کہ یہ ان کا آزمودہ طریقہ ہے، اس سے اس زمانہ میں ہندوستان کے تعلیمی طریقے اور کتابوں کی ترتیب پر روشنی پڑتی ہے، مولانا ابوالحسنات صاحب ندوی مرحوم نے اسے اپنے رسالہ ''اسلامی درسگاہیں'' میں نقل کیا ہے، اسی ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

''طریق تعلیم علم چناں کہ بہ تجربہ محقق شد آں ست کہ نخست رسائل مختصرہ صرف ونحو درس گویند سہ سہ نسخہ از ہر یکے یا چہار چہار بقدر ذہن طالب، بعد ازاں کتابے از تاریخ یا حکمت عملی کہ بزبان عربی باشد آموزند ودران میان بہ طریق تتبع لغت وبرآوردن مشکل از جائے آں مطلع سازند، چوں قدرت بزبان عربی یافت موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ مسمودی بخوانانند، وہرگز آں را معطل نگذارند، کہ اصل علم حدیث ست، وخواندن آں فیضہا دارد مارا سماع جمیع آں مسلسل ست، بعدازاں قرآن عظیم درس گویند، باں صفت کہ صرف قرآن

---

(۱) اخبارالاخیار ص۲۹۰ تا ۲۹۲۔

خواند، بغیر تفسیر وترجمہ گوید وانچہ مشکل باشد، در نحو، یا در شان نزول متوقف شود بحث نماید، بعد فراغ از درس تفسیر جلالین را بقدر درس بخواند، دریں طریق فیضہا است، بعد ازاں دریک وقت کتب حدیث بخواند مانند صحیحین وغیر آنہا وکتب فقہیہ وعقائد وسلوک ودریک وقت کتب دانشمندی مثل شرح ملا جامی وقطبی وغیر آں الا ماشاء اللہ واگر میسر آید کہ مشکوٰۃ را یک روز بخواند در روز دیگر شرح طیبی بقدر انچہ روز اول خواندہ است بخواند خیلے نافع ست''۔(۱)

تکمیل علوم کے چند لازمی طریق: ساتویں آٹھویں صدی میں طالب علموں کے لیے فنون کے مبادیات کے حفظ کرنے کے بعد مختلف فنون کی تکمیل کے لیے حسب ذیل طریقوں پر عمل کرنا ضروری تھا اور تاوقتیکہ کوئی طالب علم ان منزلوں سے گذر نہ لے اسے صاحب فن کا درجہ حاصل نہ ہوتا تھا۔

۱۔اساتذہ کے درس کے حلقہ میں زبانی خطبوں کا سلسلہ اس عہد میں بھی جاری تھا، طلبہ ان میں التزام سے شریک ہوکر املا کرتے تھے۔

۲۔اس عہد میں اساتذہ سے ہر فن کی اہم کتابوں کے سبقاً سبقاً پڑھنے کا طریقہ جاری ہو گیا تھا اور طالب علموں کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر فن کی معیاری (کلاسیکل) کتابیں استاذوں سے پڑھیں اور ان کی قرأت اور سماع کی سند اور اجازت حاصل کریں۔

۳۔طلبہ کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے استاذوں سے اجازت لینے کے بعد علم کی تحصیل کے لیے دور دراز کے سفر طے کریں، چنانچہ طلبہ اپنی جماعت کی جماعت تیار کرتے تھے اور مختلف شہروں میں گھوم کر وہاں کے ممتاز اہل علم سے علوم میں بصیرت پیدا کرتے تھے۔

۴۔ہر طالب علم کے لیے اپنے عہد کے بلند پایہ مصنفین سے شاگردی کا شرف

(۱) اسلامی درسگاہیں ص ۱۰۷، ۱۰۸۔

حاصل کرنا ضروری تھا، اس کے مدرسہ کے جو اساتذہ صاحب تصانیف ہوتے، ان سے ان کی کتابیں پڑھ کر ان کی قرأت اور سماع کی سند حاصل کرتے تھے، پھر اپنے علمی سفروں میں زیادہ تر علم کی تحصیل اسی ذریعہ سے کرتے، ہر شہر میں جو ممتاز اساتذہ اور مصنفین ہوتے تھے ان کے درس کے حلقہ میں شریک ہو کر ان کی کتابوں کی اجازت و سند حاصل کرتے تھے، کسی کتاب کا پڑھنا اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جاتا تھا، جب تک اس کے مصنف سے یا اس کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد سے اس کے پڑھنے کی اجازت حاصل نہ کر لی جاتی۔

۵۔ طلبہ جب تک علوم میں پوری بصیرت پیدا نہ کرتے وہ اختلافی مسئلوں کا مطالعہ نہ کرتے تھے، جب انہیں اپنے علم پر بھروسہ ہو جاتا، تو پھر نظر کو زیادہ وسیع کرنے کے لیے خلافیات کا مطالعہ کرتے تھے۔

۶۔ جب علمی استعداد کمال کے درجہ پر پہنچ جاتی اور فن کی اکثر کتابیں نگاہوں سے گذر جاتیں تو پھر درس و افتا کی مسند پر بیٹھتے تھے اور اپنی تصنیف اور تالیف کے ذریعہ سے فیض جاری کرتے تھے، اسی سلسلہ میں علمائے اسلام کے اختلافی مسئلوں پر تحقیق کی نظر ڈالتے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو ان خلافیات پر اپنی تصنیفات میں منصفانہ نظر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔(۱)

(۱) تذکرۃ السامع ص ۱۳۳،۱۴۲،۱۱۴،۱۱۵،۱۱۹۔

(۸)

طرزِ تعلیم ونصابِ درس کی چند خامیاں اور ان کی اصلاح کی کوششیں

امتدادِ زمانہ سے طرز تعلیم ونصاب درس میں چند خامیاں اور ان کی اصلاح کی کوششیں: امتداد زمانہ سے اسلامی طرزِ تعلیم ونصاب درس میں چند خامیاں پیدا ہوئیں اور مختلف زمانوں میں ان کی اصلاح کی کوششیں کی گئیں، جب اسلامی حکومتوں کے شباب کا دور آیا اور علما بھی حکومت کے مختلف منصبوں، افتا، قضا، خطابت اور اوقاف کی تولیت وغیرہ پر مقرر کیے جانے لگے، تو چوتھی پانچویں صدی ہجری سے لوگوں کی توجہ علم فقہ پر زیادہ مبذول ہوگئی تھی، اس کے علاوہ فقہ میں مختلف مذہبوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے خلافیات کے نام سے اس علم میں ایک مستقل باب کا اضافہ ہوگیا تھا اور تعلیم وتعلم میں بھی ان ہی چیزوں پر توجہ کی جانے لگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصاب تعلیم میں خلافیات کے رسائل زیادہ داخل ہو گئے اور دوسرے علوم کی طرف توجہ کم ہوگئی۔

امام غزالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان خامیوں کا احساس کیا اور احیاء العلوم میں ان پر تفصیل سے نظر ڈال کر ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائیں، جنہیں مولانا شبلی مرحوم نے ''تعلیم کی اصلاح'' کے عنوان سے الغزالی میں مفصل بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔امام غزالی نے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کی تقسیم کر کے جو مختلف علوم مذہبی سمجھے جانے لگے تھے،ان کی تردید کی اور ضروری علوم پر متوجہ کیا۔

۲۔خصوصاً علم فقہ کو جو اس زمانہ میں معیشت کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا، دنیاوی علوم میں شمار کیا۔

۳۔شرعی علوم کے غلط استعمال سے روکا۔

۴۔فقہی وکلامی مناظروں سے باز رکھ کر صحیح علم کلام کے حاصل کرنے کی تلقین کی۔

۵۔ان شرعی علوم کے لیے ایک مختصر نصاب تعلیم تیار کیا، جن کی تحصیل مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔

امام غزالی کی اصلاح کی اس آواز کا نتیجہ آگے چل کر مولانا شبلی مرحوم کے الفاظ میں حسب ذیل ظاہر ہوا:

''تعلیم کے نصاب میں فقہ وکلام کے ساتھ منطق وفلسفہ داخل ہوگیا، دنیوی علوم کے لیے اتنا کافی وقت نکل آیا، کہ فقہا ومحدثین بھی ریاضی داں اور حساب داں ہونے لگے،فقہ میں سے علم الخلافیات کا حصہ بالکل خارج ہوگیا،کلام کے بہت سے غیر ضروری مباحث چھٹ گئے''۔(۱)

پھر آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون نے چند اصلاحیں پیش کیں، ان سے اس عہد کی خامیوں کا بھی اندازہ ہوگا،مثلاً:

۱۔تعلیم کی ابتدا قرآن مجید سے شروع کرنے کا عام رواج اصلاح کے قابل ہے۔

۲۔جو علوم دوسرے علوم کے حاصل کرنے کے ذرائع ہوں، ان میں نہ زیادہ دقت نظر پیدا کی جائے اور نہ اس کے فروعی مسئلوں پر وقت صرف کیا جائے۔

۳۔کتابوں اور علوم کے جو مختصرات تیار کیے گئے ہیں، ان پر علم کی تحصیل کی بنیاد

(۱)الغزالی از ص ۲۱۱ تا ۲۲۰،ان مباحث کی تفصیل کے لیے دیکھئے احیاء العلوم جلد ا ص ۹ تا ۳۲۔

نہ قائم کی جائے۔

۴۔ایک ہی فن کی ایک ہی قسم کی بہ کثرت کتابیں پڑھانا نہ صرف تضیع اوقات بلکہ مانع تحصیل علم ہے۔

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے: بچوں کی تعلیم قرآن مجید سے شروع کرانے کا طریقہ اگرچہ تمام اسلامی ملکوں میں رائج تھا لیکن بعض اہل علم اسے اس لیے محل نظر سمجھنے لگے تھے کہ بچوں کو ان کی بے سمجھی کے زمانہ میں خدا کی کتاب پڑھائی جائے، چنانچہ ابن خلدون نے قاضی ابوبکر ابن عربی کے حوالہ سے اس مسئلہ پر ذیل کے خیالات ظاہر کیے ہیں:

''قاضی ابوبکر بن عربی نے اپنے سفرنامہ میں طرزِ تعلیم کے متعلق ایک نادر طریقہ پیش کیا ہے، وہ عربیت اور شعر کی تعلیم کو تمام علوم کی تعلیم پر مقدم کرتے ہیں، جیسا کہ تقریباً اہل اندلس کا طریقہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ پہلے شعر وادب کی تعلیم دینا چاہیے، پھر حساب لکھا کر اس کی مشق کرانی چاہیے، یہاں تک کہ وہ اصول وقوانین کو سمجھ سکے، اس کے بعد قرآن پڑھانا چاہیے کیوں کہ اس ترتیب سے پڑھنے سے قرآن اس کے لیے آسان ہو جائے گا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہم وطنوں کی غفلت پر ماتم ہے کہ وہ بچہ کے ہاتھ میں شروع ہی میں خدا کی کتاب پکڑا دیتے ہیں اور وہ ایسی چیز پڑھتا ہے جسے بالکل نہیں سمجھ سکتا''۔

''اس کے بعد وہ کلام پڑھانے کے لیے کہتے ہیں پھر اصول فقہ، پھر مناظرہ، اس کے بعد علوم حدیث کا درجہ دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ دو علموں کو ملا کر پڑھانے کی ممانعت کرتے ہیں، البتہ اگر طالب علم اپنی تیزی اور ذکاوت سے اس قابل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں''۔

اس کے بعد وہ یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ:

درحقیقت یہ ایک عمدہ طریقۂ تعلیم ہے لیکن جو عادتیں جاری ہیں، ان کا بدلنا

دشوار ہے اور لوگ قرآن مجید کی تعلیم کو مقدم تبرک اور ثواب کی نیت سے کرتے ہیں، اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ آگے چل کر ممکن ہے بچہ کی تعلیم جاری نہ رہ سکے تو قرآن کی تعلیم کا موقع نہ مل سکے گا خصوصاً اس لیے کہ بچے بچپن میں والدین کے مطیع رہتے ہیں، بالغ ہونے کے بعد والدین کا اختیار ان پر باقی نہیں رہتا، اس لیے اگر وہ تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر دیں گے تو قرآن کی تحصیل کا فرض باقی رہ جائے گا۔

لیکن جس بچہ کے متعلق یہ یقین ہو کہ اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع نہ ہوگا تو قاضی ابوبکر نے جو طریقۂ تعلیم بیان کیا ہے اسے اختیار کرنا بہتر ہوگا''۔(۱)

علومِ غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنانے کی مخالفت: ابن خلدون ان علوم پر جو دوسرے علوم کے پڑھنے کے وسیلہ کے لیے پڑھا جاتے ہیں اور جنہیں اس نے علوم آلیہ کی اصطلاح سے یاد کیا ہے، کم توجہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے وہ لکھتا ہے:

''متداول علوم کی دو قسمیں ہیں، ایک مقصود بالذات ہیں، جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، طبعیات، الٰہیات اور ایک وہ علوم ہیں جو ان کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، جیسے قواعد عربی، حساب، منطق، پس جو علوم مقصود بالذات ہیں اگر ان میں کلام کو وسعت دی جائے، تو کوئی حرج نہیں لیکن جو علوم دوسرے علوم کا آلہ ہیں، جیسے قواعد عربی اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیے، کہ وہ آلہ ہیں، اس لیے ان میں کلام کو وسعت نہ دینی چاہیے، کیوں کہ اس سے ان کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور علوم مقصود بالذات کی تحصیل میں رکاوٹ پیدا ہوگی، حالاں کہ وہی اہم ہیں اور اس طریقہ سے طالب علم کی عمر ان سب کی تحصیل کے لیے کافی نہ ہوگی، کیوں کہ ان علوم آلیہ کی مصروفیت میں

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۸، ۶۱۹۔

عمر ضائع ہو جائے گی، جیسا کہ متاخرین نے نحو، منطق اور اصول فقہ کے متعلق کیا ہے''۔(۱)

مختصرات سے اجتناب: ہر فن کے مسئلوں کے سمیٹنے کے لیے''مختصر'' کے نام سے جو رسالے لکھے جاتے تھے، ان کے متعلق کہتا ہے:

''اکثر متاخرین نے علوم وفنون کے طریقے کو مختصر کر دیا ہے اور ہر علم کی ایک مختصر سی فہرست مرتب کر لی ہے، جو مختصر لفظوں میں اس کے تمام مسئلوں اور دلیلوں پر مشتمل ہوتی ہے، ان لوگوں نے تفسیر اور بیان کی بڑی کتابوں کا اختصار کر لیا ہے، جیسا کہ ابن حاجب نے فقہ واصول فقہ میں ابن مالک نے قواعد عربی اور خونجی وغیرہ نے منطق میں کیا ہے لیکن تعلیم کا یہ طریقہ نقصان دہ ہے اور اس سے تحصیل میں خلل پڑتا ہے، تمام خرابیوں کے ساتھ طالب علم کے لیے بڑی دشواری یہ ہے کہ انہیں مشکل اور مختصر الفاظ کا تتبع کرنا پڑتا ہے اور ان میں سے دشواری کے ساتھ مسائل کو نکالنا پڑتا ہے، ان تمام خرابیوں کے علاوہ ان ''مختصرات'' کی تعلیم سے جو ملکۂ علمی حاصل ہوتا ہے وہ اس ملکہ سے ناقص ہوتا ہے، جو طویل الذیل کتابوں کے پڑھنے اور ایک بات کے بار بار دہرانے سے حاصل ہوتا ہے''۔(۲)

ایک ہی فن کی بہ کثرت کتابوں کی تعلیم کے نقصانات: ایک ہی فن کی بہ کثرت کتابیں پڑھنے کی مخالفت میں اس نے دکھایا ہے، کہ کتابوں کی زیادہ تصنیف علم اور تعلیم کی ترقی میں مانع ہے، لکھتا ہے:

''لوگوں کو علم کی تحصیل میں جس چیز نے نقصان پہنچایا ہے وہ کتابوں کی کثرت، اصطلاحوں کا اختلاف، تعلیم کے طریقوں کا متعدد ہونا اور پھر طالب

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۵۔ (۲) مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۰۔

علم سے ان کے یاد کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، جو کچھ ایک فن کے متعلق لکھا گیا ہے، طالب علم کی عمر اسی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لیے علم کی تحصیل میں خواہ مخواہ کوتاہی واقع ہوتی ہے، فقہ مالکی میں اس کی مثال مدونہ اور اس کی شرحیں ہیں، ابن یونس، لخمی، ابن بشیر، وغیرہ کی کتابیں اور تنبیہات ومقدمات بیان وغیرہ یہی حال ابن حاجب کی کتابوں اور اس کی شرحوں کا ہے، یہ تمام کتابیں مکرر ہیں اور معنی سب کے ایک ہیں لیکن طالب علم سے سب کے یاد کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور عمر صرف ایک ہی کتاب میں گذر جاتی ہے"۔

"اگر اساتذہ صرف مذہبی مسائل پر اکتفا کرتے تو تعلیم آسان ہو جاتی اور اس کا ماخذ قریب ہو جاتا"۔(۱)

طریقۂ تعلیم کے متعلق ابن خلدون کے چند مفید مشورے: ابن خلدون نے طریقۂ تعلیم کی مذکورۂ بالا خامیاں مٹانے کے علاوہ چند مفید مشورے بھی دیے ہیں، جو اجمالاً حسب ذیل ہیں لکھتا ہے:

"طالب علموں کے لیے علوم کی تلقین اس وقت مفید ہو سکتی ہے، جب وہ تھوڑا تھوڑا اندریجاً پڑھائے جائیں، پہلے ہر فن کے چند اصولی مسئلے ذہن نشین کرائے جائیں، پھر اجمال کے ساتھ ان کی شرح بیان کی جائے اور اس میں ان کی قوت فہم اور استعداد ملحوظ رکھی جائے، یہاں تک کہ فن کے آخری حصے انہیں سمجھائے جائیں، اس وقت ان میں اس فن کے متعلق ایک قسم کا ملکہ پیدا ہوگا اور اس کی غایت یہ ہوگی کہ وہ اس فن کے سمجھنے اور اس کے مسائل حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، پھر دوسرے فن کی جانب رجوع کیا جائے اور اسی ترتیب سے وہ فن بتدریج انہیں پڑھایا جائے اور پھر شرحوں وغیرہ سے گذر

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۶۰۹۔

کہ اس کے اختلافی مسائل سمجھائے جائیں، یہاں تک کہ وہ فن کو پورے طور پر حاصل کر لیں اور اس طریقہ سے تدریجاً ان میں عمومی علمی ملکہ پیدا ہو جائے گا، ورنہ اگر شروع ہی میں انتہائی مسائل ان پر بار کر دیے جائیں گے، تو رفتہ رفتہ ان کی طبیعت چھوٹ جائے گی اور بالآخر وہ تعلیم سے منہ موڑ لیں گے''۔

''اسی طرح فنون کی تحصیل میں ناغہ کرنا مناسب نہیں، ورنہ اس کی وجہ سے فن کا آخری حصہ اول سے منقطع ہو جائے گا اور طلبہ کو دشواری پیش آئے گی اور پراگندگی خاطر لاحق ہوگی''۔(۱)

قاضی ابن جماعہ نے بھی اپنی کتاب میں جابجا مفید تعلیمی مشورے دیے ہیں، جیسے تعلیم کے لیے اساتذہ کو بار بار نہ بدلا جائے، ایک کتاب میں پوری بصیرت حاصل کر لی جائے، پھر دوسری کتاب شروع کی جائے (۲) کتابوں کو حفظ کرنے سے پہلے ان کی دیکھ بھال کر پوری تصحیح کر لی جائے (۳) علم کو کتاب میں منحصر نہ سمجھا جائے، کیوں کہ علم صرف کتاب سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ استاذ سے شکوک رفع کرنے اور خود تحقیق و تفتیش کرنے سے مسائل حل ہوتے ہیں (۴) اور دو فنون بیک وقت حاصل نہ کیے جائیں، بلکہ یکے بعد دیگرے پڑھنا چاہیے۔(۵)

عالم اسلامی میں جدید تعلیمی انقلاب: اسلامی طریق تعلیم کی جن خامیوں کی طرف امام غزالی اور علامہ ابن خلدون نے توجہ دلائی ہے، وہ دور اخیر تک ہندوستان کی اسلامی درس گاہوں میں بھی باقی تھیں، خصوصاً نصاب تعلیم میں غیر معمولی ابتری پیدا ہو گئی تھی، طالب علموں کی عمریں علوم الیہ ہی کے پڑھنے پڑھانے میں ضائع کر دی جاتی تھیں اور شرعی علوم قرآن، حدیث اور نقد رجال وغیرہ پر کم توجہ صرف کی جاتی تھی، فقہ وکلام میں بھی سا...

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۱۔ (۲) تذکرۃ السامع ص ۱۱۷۔ (۳) ایضاً ص ۱۲۱۔ (۴) تذکرۃ السامع ص ۱۲۳ و۱۱۴۔ (۵) ایضاً ص ۵۷۔

زور خلافیات پر صرف ہوتا تھا اور فقہی اور کلامی مسائل پر علما میں باہم تفسیق و تکفیر کی عام گرم بازاری تھی، پھر جدید علوم و فنون کی تحصیل اگر کفر نہیں تو درجہ فسق تک علی گڑھ کی جدید تعلیمی تحریک کے باوجود باقی رہ گئی تھی کہ اسی اثنا میں مجلس ندوۃ العلما کی صدائے اصلاح بلند ہوئی اور اس کی توجہ خصوصاً ذیل کے اہم مسائل پر مرکوز رہی۔

۱۔ نصاب تعلیم کی اصلاح کرنا۔

۲۔ باہمی فرقہ وارانہ اختلافات اور ایک دوسرے کی تفسیق و تکفیر کو روکنا۔

۳۔ بقدر ضرورت دینی علوم کے ساتھ نئے فنون کی تعلیم دینا۔

پھر ان مقاصد کے پورے طور پر حاصل کرنے کے لیے اس مجلس نے دارالعلوم ندوۃ العلما کی بنیاد ڈالی، تاکہ ان اصولوں کے بموجب تعلیم کا صحیح طریقہ رائج ہو، دارالاقامہ کے لڑکوں کی اسلامی اخلاق کے بموجب تعلیم و تربیت کی جائے اور اس مدرسہ کے فارغ التحصیل علما ملت کی نئی ضرورتوں سے آشنا ہو کر انہیں پوری کریں۔

یہ شکر کا مقام ہے کہ آج نصف صدی کے بعد ہندوستان میں اس مجلس کی اصلاح کی صدا کے نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، آج ہندوستان میں نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلما میں تعلیم کا نیا نصاب جاری ہے، بلکہ تدریجاً دوسرے اسلامی مدرسوں نے بھی کم و بیش اس کی یہ دعوت قبول کر لی ہے اور ہر مدرسہ کے نصاب تعلیم میں کچھ نہ کچھ تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔

فرقہ وارانہ اختلافات اور باہمی تفسیق و تکفیر فقہ اور کلام کے خلافیات کے باب سے پیدا ہوئے تھے، ندوۃ العلما کو اس کے دوسرے مقصد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ ہندوستان کے مختلف اسلامی فرقوں میں باہمی رواداری کا تخیل پیدا ہو چکا ہے اور تکفیر و تفسیق کے باب میں اگرچہ علمائے زمانہ کی زبانیں اب بھی کبھی کبھی کھل جاتی ہیں اور مفترین کا ایک مختصر گروہ مستقل طور پر موجود ہے، تاہم ان کے فتووں کا اثر صرف زبان قلم

سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر بدنما داغوں کے چھوڑ جانے کے سوا اور کوئی ظاہر نہیں ہوتا، اسلامی ہند کا سنجیدہ خیال تعلیم یافتہ طبقہ تکفیر کے ان فتوؤں کو وقعت نہیں دیتا اور یہ فتاوے عقائد کی اصلاح کرنے کے بجائے تمسخر واستہزا کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

اسی طرح اسے تیسرے مقصد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ آج ملک میں ندوۃ العلما کے بکثرت اور دوسرے مدارس کے خال خال فارغ التحصیل علما قدیم و جدید دونوں علوم کے حامل نظر آتے ہیں۔

اسی طرح دیگر اسلامی ممالک میں بھی تعلیمی انقلاب برپا ہوا، کہیں ندوۃ العلما کی صدائے بازگشت کے طور پر اور کہیں زمانہ نے ہوا کا رخ خود پلٹ دیا، مصر میں شیخ جمال الدین افغانی مرحوم کے مسند نشیں علامہ رشید رضا نے جنہوں نے اسی سال اس دار فانی کو الوداع کہا، نہ صرف ہندوستان آ کر ندوۃ العلما کی تحریک میں عملی حصہ لیا، بلکہ مصر واپس جا کر انہوں نے دارالدعوۃ والارشاد کے نام سے ان ہی مقاصد کے ساتھ ایک دارالعلم قائم کیا، پھر مصر کی قدیم اور مستند اسلامی درس گاہ جامعہ ازہر کے علما نے بھی ہوا کا رخ پہچانا اور نئی اصطلاحات قبول کر کے اسے نئی شاہراہ پر لائے، اسی طرح مصر میں دوسرے نئے مذہبی مدارس اسکندریہ زمانہ تعمیر (۱۹۱۳ء) السیوط ۱۹۱۵ء زقازیق (۱۹۲۵ء) وسوق دمیاط وغیرہ تعلیمی مجلس کی نگرانی میں نئے طریق پر تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

عراق میں جامعہ آل البیت کی بنیادیں استوار ہو چکی ہیں کہ دارالعلم بغداد میں مدرسہ نظامیہ و مستنصریہ کا منظر پھر سامنے آ جائے۔

تیونس کا جامع زیتونیہ محمد بن ابی شنب جیسے صاحب علم کی مدد سے ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔

ٹرکی میں جدید دور جمہوریت کے ساتھ تعلیمی انقلاب بھی برپا ہو چکا ہے اور اب وہ غیر ممالک کے تعلیمی مرکزوں کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔

ایران رضا شاہ پہلوی کے سایہ میں تعلیمی ترقیوں میں مصروف ہے اور اب دانش گاہ ایران سے علوم وفنون کی نئی روشنی پھیل رہی ہے۔

ہمارا ہمسایہ ملک افغانستان بھی تعلیم کے لیے کوشش کر رہا ہے اور کابل یونیورسٹی کی بنیاد پڑ چکی ہیں۔

×××××××××××××××

ISLAMI NIZAM-E-TALEEM

Saiyid Riyasat Ali Nadvi

Darul Musannefin Shibli Academy
Azamgarh.U.P. - 276 001
Ph. 05462 - 265080, 265017
www.shibliacademy.org
E-mail: shibli_academy@rediffmail.com